کلّیاتِ
مُصطفیٰ زیدی

کلیاتِ مصطفیٰ زیدی

کلیاتِ مصطفیٰ زیدی

مصطفیٰ زیدی

الحمد پبلی کیشنز
رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی) ۔ لیک روڈ۔ لاہور

ہماری کتابیں .....

خُوبصورت، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین و اہتمام اشاعت

صفدر حسین

ضابطہ :

اشاعت : اکتوبر ۱۹۹۸ء

مطبع : شرکت پریس لاہور

قیمت : ۳۰۰/- روپے

روشنی

مصطفیٰ زیدی

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی) ۔ لیک روڈ۔ لاہور

فہرست

تخلیق

کتنے جاں سوز مراحل سے گذر کر ہم نے
اس قدر سلسلۂ سود و زیاں دیکھے ہیں

رات کٹتے ہی بکھرتے ہوئے تاروں کے کفن
جھومتی صبح کے آنچل میں نہاں دیکھے ہیں

جاگتے ساز، دمکتے ہوئے نغموں کے قریب
چوٹ کھائی ہوئی قسمت کے سماں دیکھے ہیں

ڈوبنے والوں کے ہمراہ بھنور میں رہ کر!
دیکھنے والوں کے اندازِ بیاں دیکھے ہیں

مدتوں اپنے دلِ زار کا ماتم کر کے
خود سے بڑھ کر بھی کئی سوختہ جاں دیکھے ہیں

موت کو جن کے تصوّر سے پسینہ آجائے
زیست کے دوش پہ وہ بارگراں دیکھے ہیں!

تب کہیں جا کے ان اشعار کے گہوارے میں
اک بصیرت کے ہمکنے کے نشاں دیکھے ہیں

چراغ آفریدم

"روشنی" کا پہلا ایڈیشن ۴۹ء میں الٰہ آباد

(یوپی) سے شائع ہوا تھا۔ اس وقت اس مجموعے

کی ہیئت موجودہ ہیئت سے مختلف تھی۔ اس ترمیم

اور اضافے کے حق میں اور اس کے خلاف بہت

کچھ کہا جا سکتا ہے۔ دراصل میں اس کتاب

کو دوبارہ شائع کرنے پر تیار نہ تھا، اور بغیر

ترمیم اور اضافے کے اس کی دوبارہ اشاعت

میرے لئے اب بھی بعید از قیاس ہے۔ اس کے یہ

معنی نہیں کہ میں اس دوسری اشاعت پر نادم

ہوں، یا اپنی ابتدائی نظموں سے شرمسار ہو رہا

ہوں۔ اس میں مجھے ادبی بد دیانتی بھی نظر نہیں
آتی اس لئے کہ جن نظموں کا اضافہ کیا گیا ہے
بیشتر اسی زمانے کی ہیں۔ یہ طالبعلمی کا زمانہ
تھا جب محض تجربے کے لئے آدمی بڑی بڑی،
تحریکوں میں شامل ہو جاتا ہے، جب متوقع باتیں
غیر متوقع طور سے ہوتی رہتی ہیں، اور جب نئے
جذبات کی آہٹ سے سارا وجود سنسناتا رہتا ہے
اسے ابھی ذہنی رکھ رکھاؤ نصیب نہیں ہوتا۔
یہ درست ہے کہ اس افتادِ طبع سے جو شعر نمودار
ہوتے ہیں، ان کا اپنا رنگ ہوتا ہے، بلکہ
آگے چل کر اسی رنگ کو شاعر ترستا رہ جاتا ہے
اور یہ دوبارہ نصیب نہیں ہوتا، لیکن میں
یہ چاہتا تھا کہ میرے جو دو مجموعے "روشنی"

کے بعد شائع ہوئے ہیں، ان میں اور "روشنی"
میں اتنا ذہنی فاصلہ نہ رہ جائے کہ یہ کتابیں
آپس میں ایکدوسرے کے لئے اجنبی بن جائیں

اس مجموعے کی تمام نظمیں ۵۴ء اور ۵۰ء کے
درمیان کی ہیں۔ یہ نظمیں مجھے الہ آباد کے ان
دنوں کی یاد دلاتی ہیں جب خوشی خوشی کی
طرح اور غم غم کی طرح ہوتا تھا۔ "ادب"،
جمالیات، اور جدلیات پر دن رات بحثیں ہوا کرتی
تھیں۔ بحث میں شامل ہونے والے بزرگ بھی
تھے، جوان بھی تھے، اور محض دیکھنے والے
بھی۔ فراق گورکھپوری، اپندر ناتھ اشک،
بلونت سنگھ، وامق جونپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین،
پروفیسر مسیح الزمان اور مسعود اختر جمال کے
ساتھ ساتھ معصوم رضا راہی، دیوندر اسر، اور
میں ان نوجوانوں میں سے تھے جو انہی صحبتوں
میں بیٹھتے تھے۔ کبھی بیت بازیاں ہوتی تھیں

اور اس شرط کے ساتھ کہ آج صرف غالب، میر، سودا اور انیس کے کلام سے حصے سنائے جائیں گے یا آج صرف بلینک ورس کے مصرعے پڑھے جائیں گے۔ جوش ملیح آبادی، ساحر لدھیانوی اور مجاز مرحوم بھی گاہے گاہے الہ آباد آجاتے تھے۔ آئے دن مشاعرہ ہوتا تھا، افسانے اور مضامین پڑھے جاتے تھے۔ ادب برائے ادب پر بحث برائے بحث ہوا کرتی تھی۔ چھوٹے موٹے ڈرامے اسٹیج کئے جاتے تھے۔ بے ضرر لگاوٹوں سے لے کر خطرناک محبتوں تک کے مراحل طے ہوتے رہتے تھے۔

یوونگ کرسچین کالج اور الہ آباد یونیورسٹی یہ دو ادارے جن میں میں نے تعلیم پائی ہے، محض تعلیمی ادارے نہ تھے بلکہ تربیتی مرکز بھی تھے جن میں ہر طرح کے خیال کو برداشت کرنے کی صلاحیت تھی۔ عام طور پر اساتذہ اپنے طالبعلموں کے رومانی اور سیاسی دونوں

رجحانات کو رومانی ہی سمجھتے تھے۔ اگر ایسا
نہ ہوتا تو کتنے ہی طالب علم نادانستہ اپنی
صحیح منزل کی تلاش کے بغیر مختلف جماعتوں
کے آلۂ کار بن گئے ہوتے۔ "روشنی" کے پہلے
ایڈیشن میں جو نعرے بازی کی چند نظمیں تھیں،
ان کی فضا رومانی تھی، اور انہوں نے مجھے
مقام شعر کے صحیح ادراک سے بہت علیحدہ نہیں
کیا۔ اس زمانے کے الحاد کی بھی یہی کیفیت
تھی کہ مذہبی جنون کے ردعمل کے طور پر
اختیار کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب
جوش ملیح آبادی ایک طرف "پڑھ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا
انسان" اور دوسری طرف "ہم رند بھی
ہیں حلقۂ ماتم میں اے حسین" کہتے ہیں تو
یہ تضاد میری سمجھ میں آتا ہے اور مجھے اس
سے الجھن پیدا نہیں ہوتی۔

ایک بار پھر یہ اعلان ضروری ہے کہ یہ
نظمیں اس زمانے کی ہیں جب میرا نہ صرف تخلص

ہوتا تھا بلکہ تیغ الہ آبادی جیسا تخلص ہوتا تھا کہ نظم پڑھنے والا کچھ کہنے سننے کی جرأت نہ کرے ۔ اب نہ تیغ رہ گیا ہے نہ الہ آباد رہ گیا ہے ، پرانی محبتوں کے مزار پر نئی گھاس اُگ چکی ہے اور یہاں تک ہے کہ روایتوں میں جو ربطِ غائبانہ ہوتا ہے ، اس کی کڑیاں بھی ٹوٹنے لگی ہیں ۔

مصطفیٰ زیدی

A book is a great cemetary
in which, for the most part,
the names of the tombstones
have been effaced.

— PROUST

روشنی

ترے حضور مرے ماہ و سال کی دیوی
میں ارضِ خاک کا پیغام لے کے آیا ہوں

جسے خرد کا مکمّل شعور پا نہ سکا
وہ قلبِ شاعرِ ناکام لے کے آیا ہوں

فریبِ عشرتِ معیار میرے پاس نہیں
غمِ حقائقِ ایام لے کے آیا ہوں!

بکھر رہے ہیں پرستارِ عالمِ ارواح
کہ حسنِ کشورِ اَجسام لے کے آیا ہوں

سمجھ سکے تو سمجھ لے کہ استعاروں میں
میں اپنی زیست کا ابہام لے کے آیا ہوں

نشیبِ ظلمتِ الحاد کو کھنگالا ہے
فروغِ سینۂ الہام لے کے آیا ہوں

مری صدا میں دھڑکتا ہے کائنات کا دل
بہ طرزِ خاص غمِ عام لے کے آیا ہوں

گلی گلی مری آوارگی کے قصّے ہیں!
نفس نفس پہ اک الزام لے کے آیا ہوں

مری حیات کے گرتے ہوئے کگاروں کو
سنبھال لے کہ ترا نام لے کے آیا ہوں

(۲)

غزلیں نہیں لکھتے ہیں قصیدہ نہیں کہتے
لوگوں کو شکایت ہے وہ کیا کیا نہیں کہتے

اور اپنا یہی جرم کہ با وصفِ روایت
ہم ناصحِ مشفق کو فرشتہ نہیں کہتے

اجسام کی تطہیر و تقدس ہے نظر میں
ارواح کے حالات پہ نوحہ نہیں کہتے

ہم نے کبھی دنیا کو حماقت نہیں سمجھا
ہم لوگ کبھی غم کو تماشا نہیں کہتے

انسان کے چہرے کے پرستار ہوئے ہیں
اور قاف کی پریوں کا فسانہ نہیں کہتے

وہ بھی تو سنیں میرے یہ اشعار کسی روز
جو لوگ نئی نسل کو اچھا نہیں کہتے

انسان پیدا ہو گیا

سیّالِ ماہ تاب زر افشاں کی دھوم ہے
بدلے ہوئے تصوّرِ ایماں کی دھوم ہے
اخلاق سے لطیف تر عصیاں کی دھوم ہے
اعلانِ سرفروشیٔ رِنداں کی دھوم ہے
باراں کے تذکرے ہیں بہاراں کی دھوم ہے
اب سرنگوں ہے کتنے بزرگانِ فن کی بات

اب پیشِ محکمات گریزاں ہیں ظنّیات
اب محض سنگِ میل ہیں کل کے تبرّکات
مدّت سے اب نہ کوئی عجوبہ نہ معجزات
دندان شکن حقیقتِ عُریاں کی دھوم ہے

اِک بات آگہی کے لبوں سے نکل گئی
اوہام کی قدیم حکومت بدل گئی
فولاد کے بتوں کی روایت پگھل گئی!
اک جنبشِ نگاہ سے زنجیر گَل گئی
زنداں میں طمطراقِ اسیراں کی دھوم ہے

(۲)

آسماں گیر ہے زلفوں کا دھواں کہتے ہیں
جشن بردوش ہے فردوس رواں کہتے ہیں
آج انسان ہے میر دوجہاں کہتے ہیں

اب لچکتی نہیں کوشش سے بھی غلماں کی کمر
جل گئے جدّتِ تحقیق سے اوہام کے پر
ابدی ہے یہ جہانِ گذراں کہتے ہیں

رہرو و آ ہی گئی منزلِ عصرِ مسعود
جن کو کل لوگ سمجھتے تھے بتانِ معبود
اب اُنہیں ذہن کی آوارگیاں کہتے ہیں

آج کیوں میرے شب و روز ہیں محروم گداز
اے مری روح کے نغمے، مرے دِل کی آواز

اک نہ اک غم ہے نشاطِ سحر و شام کے ساتھ
اور اس غم کا نہ مفہوم نہ مقصد نہ جوَاز

میں تو اقبالؔ کی چوکھٹ سے بھی مایوس آیا
میرے اشکوں کا مداوا نہ بدخشاں نہ حجاز

چند لمحوں سے یہ خواہش کہ دوامی بن جائیں
ایک مرکز پہ رہے سُرخ لہو کی ہَل چَل،

کبھی ہر گام پہ ٹھوکر، کبھی منزل کا حریف
اے جہانِ گذراں ایک سے انداز پہ چل

دن کو مہکا ہوا بَن شام کو تپتی ہوئی ریت
زندگی ایسے طلسمات کے حلقے سے نکل
کہیں حد درجہ لگاوٹ کہیں آہٹ سے گریز
دلِ محبوب نما اور سنبھل اور سنبھل

اور کبھی یہ، کہ اگر ایک پلک بھی ٹھہرے
کوئی لمحہ تو ہر اک سانس گراں ہو جائے
اگر اک گلشنِ بے خار رہے دامنِ وقت
یہ جہانِ گُذَراں ریگِ رَواں ہو جائے
دیسا مذہب کہ خود اس وجہِ تعالیٰ سے گریز
ایسا الحاد کہ سجدے میں نہاں ہو جائے

اے مری روح کے نغمے، مرے دل کی آواز
لطفِ شب تاب یہی رقصِ شرر ہو شاید
منزلیں پاس سے بھی دور رہا کرتی ہیں
جستجو حاصل و عرفانِ سفر ہو شاید

کوئی الحاد میں نازاں کوئی ایمان میں گم
کبھی اس دِیدہ و دِل کی بھی سَحر ہو شاید

میرے غم ہی میں نہاں ہو نئے سورج کی کِرَن
کمَ نگاہی میں ہی پوشیدہ نَظَر ہو شاید

کِرن

چھپ گئے رات کے دامن میں ستارے لیکن
ایک ننھّا سا دِیا اب بھی ہے ہم راہ و نشاں
ایک ننھا سا دیا اور یہ شب کی یورش
اور یہ ابر کے طوفان، یہ کُہرا، یہ دُھواں

لیکن اس ایک تصوّر سے نہ ہو افسردہ
ساعتیں اب بھی نیا جوش لئے بیٹھی ہیں
سنگِ رہ اور کئی آئیں گے لیکن آخر
منزلیں گرمئ آغوش لئے بیٹھی ہیں

اک نئے عہد کی امید ، نئی صبح کی ضو !!
اس اندھیرے سے ابھرتے ہیں چراغاں کتنے
زیست کے جامۂ صد چاک کا ماتم کیسا !
زیرِ تخلیق ہیں خلّاق گریباں کتنے

چھپ گئے رات کے دامن میں ستارے لیکن
یہ تری شعلہ نوائی کا نیا دور سہی !
عزمِ پرواز کی توہین سے مایوس نہ ہو
ایک بار اور سہی ، اور سہی ، اور سہی

سیاہ لہو

ایک دل اور اتنے بارِ گراں
اُونگھتے پیڑ، سرنگوں کلیاں
مضمحل نور، مضمحل خوشیاں
اَن گنت خواب، اَن گنت ارماں
بے مہک پھول، ادھ کھلی کلیاں

بادشاہوں کا قصۂ من و تو!
تیرہ سکوں کا تیرہ تر جادو
سُرخ تاریکیاں، سیاہ لہو
منتشر رات، منتشر گیسو
بے اثر آہ بے اثر آنسو

ذہن کی قبر، دل کا ویرانہ
فکرِ روزی، تلاشِ مے خانہ
کوئی باعقل کوئی دیوانہ!
میری تحقیق اُس کا افسانہ
زرد بتّی، اُداس پروانہ!

الغرض اک نہ اک غمِ گل و خار
فلسفے کا خمار، عشق کا بار!!
دل کو اک صبح و شام کا آزار!
حسرتِ صلح و حسرتِ پیکار
صیدِ ابلیس و کشتۂ یزداں!

آج بھی

پھیلی ہوئی ہے شام گراں تا گراں مگر
کون و مکاں میں ساعتِ زنداں ہے آج بھی

اس فلسفے کی سوزنِ پنہاں کے باوجود
چاکِ جگر حقیقتِ عریاں ہے آج بھی

اس نوجوان عصرِ ترقی پسند میں
اک کہنہ یادِ وقت بداماں ہے آج بھی

کیا کیا نگار مثلِ بہاراں گذر گئے
ضرب المثال یوسفِ کنعاں ہے آج بھی

اس عہدِ رنگ و نور کی عبرت فروز یاد
اک شمعِ سوگوار فروزاں ہے آج بھی

ممکن ہوائے صبا تو رمیدہ غزال سے
کہنا کہ ایک روحِ غزلخواں ہے آج بھی

گسٹاپو

سفید پوش! ترے دل کی تیرگی کی قسم
کہ تو نے نجم و گہر کا خمیر بیچا ہے

حقیر جاہ و حشم کے حصول کے بدلے
دل و دماغ دئے ہیں، ضمیر بیچا ہے

میں معترف ہوں کہ ہے میرا جرم حق گوئی
مگر یہ مخبری حق گناہ ہے کہ نہیں

پیمبروں کے لہو سے بنی ہے جس کی بساط
وہ شاہراہ تری شاہ راہ ہے کہ نہیں

حیات کے لئے بنیاد ہے نمودِ خیال
تجھے خبر نہیں انسان کیسے جیتا ہے

تری غذا میں شہیدوں کا خون شامل ہے
ترا وجود تعفن کا دُودھ پیتا ہے

یہی نہیں کہ تجھے پست ذہن کہتے ہیں
وہ لوگ جن کی نظر آج آسمان پہ ہے

تجھے ذلیل سمجھتے ہیں خود رفیق ترے
ہے ان کے دل میں وہی جو مری زبان پہ ہے

تجھے خبر نہیں شاید کہ وَلوَلوں کا چراغ
سمومِ تُند کے باوصف جلتا رہتا ہے

درندگی کے مقدّر پہ ناچنے والے
درندگی کا مقدّر بدلتا رہتا ہے

بلندیوں پہ تشدّد کے مطربِ کہنہ
زمیں کے ساز پہ ہم لوگ گیت گائیں گے

نئی بہار ہمیں سرکشوں کے ہات میں ہے
نیا نظام ہمیں منچلے بنائیں گے

اگست ۴۷ء

ابھی غبارِ سرِ کارواں نہیں بیٹھا
عروسِ شب کی سواری گذر گئی ہے ضرور

ابھی ہماری محبّت پہ آنچ پڑنی ہے
کسی کی زلف پہ افشاں بکھر گئی ہے ضرور

ابھی بہت سے سویروں کو اوس پینی ہے
کسی کی پھول سی رنگت نکھر گئی ہے ضرور

ہمیں بھی بننا ہے اس التفات کے قابل
وہ التفات کا وعدہ تو کر گئی ہے ضرور

بعد ہر تقریر

(ایک طنزیہ)

شروع کرتا ہوں اس بیاں کو
بہ حمد و تحسینِ ذات باری

کہ جس کی مرضی کے ماتحت ہیں
ہمارے افعالِ اختیاری

اُسی کے احکام سے مسرّت
اُسی کی مرضی سے سوگواری

جناب صدر اور اہل محفل
یہ آپ بھی جانتے ہیں میں بھی

کہ آج کل کے تمام شاعر
فقط نجاست اچھالتے ہیں

اساتذہ کی روش سے ہٹ کر
نئی زمینیں نکالتے ہیں

عروض سے ان کو واقفیّت
نہ کچھ سلیقہ ہے زیر و بم کا!

یہ شاعری ہے کہ نقشِ عظمت
نہ برق کوندی نہ اَسپ چمکا

نہ بادشاہوں کی نغمہ خوانی
نہ تذکرہ کعبہ و حرم کا

نیا اَدب، عرض کرچکا ہوں
کہ چند نعروں پہ مشتمل ہے

نہ اِس میں مژگاں نہ اس میں اَبرو
نہ اِس میں کاکل نہ اس میں دل ہے

جو ایک مصرع ہے بحرِ اعظم
تو دوسرا جوئے مضمحل ہے

میں پوچھتا ہوں کہ ہم صفیرو
یہ بے محل انتظار کب تک

سکوتِ تشکیلِ قوم تا کے!
جمودِ تبلیغِ کار کب تک

برائے تبلیغِ کار یارو
خیال کی مشعلیں بجھا دو

برائے تشکیلِ قوم ہم کو
تجوریوں کے دَہن دکھا دو

تجدید

اُس کی بے باکیوں میں غصہّ تھا
اس کے غصےّ میں پیار تھا ساتھی

آج اس نوبہار کے رُخ پر
کِس غضب کا نکھار تھا ساتھی

ایک سرکش امنگ سینے میں
اس طرح اپنا سر اٹھاتی تھی

اس کے نم عارضوں کے سائے میں
اس کی سانسوں کی آنچ آتی تھی

اس کا شکوہ کہ شعر لکھ لکھ کر
آپ نے کر دیا مجھے بدنام

ایک افسانہ ہے یہ سوز و گداز
ایک وقتی کسک ہے یہ کہرام"

میرا کہنا کہ "تم نے دیکھ لیا
یہ فسانہ اٹل حقیقت تھا"

بحث کی بے پناہ وسعت میں
میں نے اس ماہ رُخ کو جیت لیا

نرم انگڑائیاں بکھرتی ہیں
آج چھیڑا ہے وقت نے وہ راگ

ساری دُنیا میں دُھوپ نکلی ہے
جاگ اے سرزمینِ سنگم جاگ

شطرنج

عزیز دوست مرے ذہن کے اندھیرے میں
ترے خیال کے دیپک بھٹک رہے ہیں ابھی

کہاں سے ہو کے کہاں تک حیات آ پہنچی
اداس پلکوں پہ تارے چھلک رہے ہیں ابھی

ترے جمال کو احساسِ درد ہو کہ نہ ہو
بجھے پڑے ہیں ترانے ستار زخمی ہیں

حیات سوگ میں ہے بے زبان دل کیطرح
کہ نوجوان امنگوں کے ہار زخمی ہیں

مرے رفیق! مرے رازداں! مرے ساتھی
میں تیرے ذہن پہ تجھ کو دعائیں دیتا ہوں

تجھے یہ رقصِ مسلسل کا دور راس آئے
تری نگاہ میں گاتا رہے یوں ہی افسوں

مِرے شعور کی اس خامکار دنیا نے
خرد کی چال کو دل کی پکار سمجھا تھا

یہ میری اپنی خطا تھی کہ بزمِ ہستی میں
مرا خلوص سیاست کو پیار سمجھا تھا

ترا دماغ سلامت رہے کہ اس کے عوض
ترے حضور میں کُل کائنات ہے ساتھی

ابھی جو کل مِرے دکھ درد کا مداوا تھی!
وہ آج تیری شریکِ حیات ہے ساتھی

نیا آذر

مری رفیقِ طرب گاہ، تیری آمد پر
نئے سُروں میں نئے گیت گائے تھے میں نے

نفس نفس میں جلا کر اُمید کے دیپک
قدم قدم پہ ستارے بچھائے تھے میں نے

ہوا سے لوچ، گلی سے نکھار مانگا تھا
ترے جمال کا چہرہ سنوارنے کے لئے

کنول کنول سے خریدی تھی حسرتِ دیدار
نظر نظر کو جگر میں اتارنے کے لئے

بہت سے گیت چھلکتے رہے اُفق کے قریب
بہت سے پھول برستے رہے فضاؤں میں

اُلجھ اُلجھ گئیں مجروح زیست کی گرہیں
بکھر بکھر گئیں انگڑائیاں خلاؤں میں

میں پوچھتا ہوں کہ اے رنگ و نور کی دیوی
علاجِ تیرہ شبی کیا اِسی کو کہتے ہیں!

بجھے بجھے سے یہ مفلس دیئے نہ جانے کیا
سُلگ سُلگ کے تری بے حسی کو کہتے ہیں

یہ گیت سر بگریباں ہیں تیرے جانے سے
یہ نو عروس ستارے بڑھا رہے ہیں سہاگ

کلی کلی کو تری بے رخی کا شکوہ ہے
نفس نفس سے نکلتی ہے ایک ایسی آگ

جسے بجھاؤں تو دل زمہریر ہو جائے
ترا عظیم تصوّر حقیر ہو جائے

اِرتقا

یوں تو اِس وقت کے پھیلے ہوئے سناٹے میں
رات کے سینے سے کتنے ہی گجر پھوٹے ہیں

عقل کو آج بھی ہے تشنہ لبی کا اقرار
سیکڑوں جام اٹھے ، سیکڑوں دل ٹوٹے ہیں

زلزلے آئے ہیں ادراک کی بنیادوں میں
عشق کا جذبۂ محکم بھی سہارا نہ بنا

ایک شعلے کو بھی حاصل نہ ہوا رقصِ دوام
ایک آنسو بھی مُقدر سے ستارا نہ بنا

کس کو معلوم کہ اُجداد پہ کیا کچھ گذری
خون سے آلودہ ہیں اس راہ پہ قدموں کے نشان

انہی راہوں سے پیمبر بھی گئے ، ملحد بھی ،
انہی راہوں پہ بھٹکتا رہا بے بس انساں

زندگی ایک ستائے ہوئے طائر کی طرح
پھڑپھڑاتی رہی تاریخ کی زنجیروں میں

اور سقراط و فلاطون و ارسطو کا لہو !
رنگ بھرتا رہا لمحات کی تصویروں میں

کون سے جال نہ ڈالے گئے ہر مرکز پر
کیا جیالے تھے کہ جو مائل پرواز رہے

ابدیت کے نشاں لمحۂ نازک کے نقوش
بشریت کے لئے راز تھے اور راز رہے

وہ اجنبی

وہ مہر و ماہ و مشتری کا ہم عناں کہاں گیا
وہ اجنبی کہ تھا مکان و لامکاں کہاں گیا!

ترس رہا ہے دل کسی کی داوری کے واسطے
پیمبرانِ نیم جاں خدائے جاں کہاں گیا

وہ ملتفت بہ خندہ ہائے غیر کس طرف سے آج
وہ بے نیازِ گریہ ہائے دوستاں کہاں گیا

وہ ابر و برق و باد کا جلیس ہے کدھر نہاں
وہ عرش و فرش و ماورا کا رازداں کہاں گیا

وہ میزباں کہاں ہے جس کی دید بھی محال تھی
جو آج تک نہ آسکا وہ میہماں کہاں گیا

بُجھی پڑی ہے ماہ تاب و کہکشاں کی انجمن
وہ صدرِ بزم ماہ تاب و کہکشاں کہاں گیا

یہ کائناتِ آب و گِل ہے جسکے غم میں مُضمحِل
دیا ہے جس نے سوزِ دل وہ مہرباں کہاں گیا

چمک رہی ہیں دُور دُور تک اُداس پٹریاں
مسافرو! بتاؤ میرِ کارواں کہاں گیا

کردار

خیال و خواب کی دنیا کے دل شکستہ دوست
تری حیات مری زندگی کا خاکہ ہے

غمِ نگار و غمِ کائنات کے ہاتھوں!
ترے لبوں پہ خموشی ہے، مجھ کو سکتہ ہے

مری وفا بھی ہے زخمی تری وفا کی طرح
یہ دل مگر وہی اک تابناک شعلہ ہے

ترا مزار ہے اینٹوں کا ایک نقشِ بلند
مرا مزار مرا دل ہے، میرا چہرہ ہے

جو زہر پی نہ سکا تو حیات سے ڈر کے
وہ زہر اب بھی بدستور پی رہا ہوں میں

شدید کرب میں تو نے تو خودکشی کر لی
شدید تر غمِ ہستی میں جی رہا ہوں میں

اِنتہا

پھر آج یاس کی تاریکیوں میں ڈوب گئی !
وہ اک نوا جو ستاروں کو چوم سکتی تھی

سکوتِ شب کے تسلسل میں کھو گئی چپ چاپ
جو یادِ وقت کے محور پہ گھوم سکتی تھی

ابھی ابھی مری تنہائیوں نے مجھ سے کہا
کوئی سنبھال لے مجھ کو، کوئی کہے مجھ سے

ابھی ابھی کہ میں یوں ڈھونڈتا تھا راہِ فرار
پتہ چلا کہ مرے اشک چھن گئے مجھ سے

یاد

رات اوڑھے ہوئے آئی ہے فقیروں کا لباس
چاند کشکولِ گدائی کی طرح نادم ہے

دل میں دہکے ہوئے ناسور لئے بیٹھا ہے
یہی معصوم تصوّر جو ترا مجرم ہے

کون یہ وقت کے گھونگٹ سے بلاتا ہے مجھے
کس کے مخمور اشارے ہیں گھٹاؤں کے قریب

کون آیا ہے چڑھانے کو تمنّاؤں کے پھول
ان سلگتے ہوئے لمحوں کی چتاؤں کے قریب

وہ تو طوفان تھی، سیلاب نے پالا تھا اسے
اس کی مدہوش اُمنگوں کا فسوں کیا کہیئے

تھرتھراتے ہوئے سیماب کی تفسیر بھی کیا
رقص کرتے ہوئے شعلے کا جنوں کیا کہیئے

رقص اب ختم ہوا موت کی وادی میں مگر
کسی پائل کی صدا روح میں پائندہ ہے

چھپ گیا اپنے نہاں خانے میں سورج لیکن
دل میں سُورج کی اک آوارہ کرن زندہ ہے

کون جانے کہ یہ آوارہ کرن بھی چُھپ جائے
کون جانے کہ اُدھر دُھند کا بادل نہ چھٹے

کس کو معلوم کہ پائل کی صدا بھی کھو جائے
کس کو معلوم کہ یہ رات بھی کاٹے نہ کٹے

زندگی نیند میں ڈوبے ہوئے مندر کی طرح
عہدِ رفتہ کے ہر اک بُت کو لئے سوتی ہے

گھنٹیاں اَب بھی مگر بجتی ہیں سینے کے قریب
اب بھی پچھلے کو، کئی بار سحر ہوتی ہے

سنّاٹا

آج پھر تم نے مرے دل میں جگایا ہے وہ خواب
میں نے جس خواب کو رو رو کے سُلایا تھا ابھی

کیا ملا تم کو انہیں پھر سے فروزاں کر کے
میں نے دہکے ہوئے شعلوں کو بجھایا تھا ابھی

میں نے کیا کچھ نہیں سوچا تھا مری جانِ غزل
کہ میں اس شعر کو چاہوں گا، اسے پوجوں گا!

اپنی ترسی ہوئی آغوش میں تارے بھر کے
قصرِ مہتاب تو کیا عرش کو بھی چھولوں گا

تم نے تب وقت کو ہر زخم کا مرہم سمجھا
اور ناسور مرے دل میں چمکتے بھی رہے

لذتِ تشنہ لبی بھی مجھے شیشوں نے نہ دی
محفلِ عام میں تا دیر چھلکتے بھی رہے

اور اب جب نہ کوئی درد نہ حسرت نہ کسک
اک لرزتی ہوئی لَو کو تہِ داماں نہ کرو!

تیرگی اور بھی بڑھ جائے گی ویرانے کی
میری اجڑی ہوئی دنیا میں چراغاں نہ کرو

تشنگی

آپ نے جس کو فقط جنس سے تعبیر کیا
ایک مجبور تخیل کی خود آرائی تھی

ایک نادار ارادے سے کرن پھوٹی تھی
جس کے پس منظرِ تاریک میں تنہائی تھی

دلِ ناداں نے چمکتی ہوئی تاریکی کو
اپنے معیار کی عظمت کا اُجالا سمجھا

ہائے وہ تشنگیٔ ذہن و تمنّا جس نے
جب بھی صحرا پہ نظر کی اُسے دریا سمجھا

ناز تھا مجھ کو جن اوصافِ حکیمانہ پر
کیسے رندانہ اشاروں پہ بہک جاتے ہیں

لڑکھڑاتے ہیں خیالات مرے سینے میں
راہ رو جیسے بیاباں میں بھٹک جاتے ہیں

اپنی محفل کی بھی کیا بات ہے جس سے اکثر
دوست اٹھتا ہے تو یوں جیسے عدو ہوتا ہے

ایسے ملتا ہے محبت کو ہوس کا الزام
ایسے برسوں کی ریاضت کا لہو ہوتا ہے

فیصلہ

یہ حلقۂ احباب کی ہے متفقہ رائے :-

اے محوِ فغاں ہم نے بھی دیکھا ہے زمانہ
کہتے ہیں جسے عشق وہ ہے ذہن کا اک روگ

دنیا کی کشاکش سے نکلنے کا بہانہ
ہم نے بھی کئی دیکھی ہیں بنتِ شبِ مہتاب

معمول کی اشیا ہیں نہ افسوں نہ فسانہ
جذبات کے اس حجلۂ تاریک سے نکلو

دنیا ہے سوئے منزلِ خورشید روانہ
مانا کہ وہ اک گوہرِ نایاب ہے لیکن

دھرتی کا کلیجہ ہے نوادر کا خزانہ

اس بات کی دنداں شکنی سے نہیں انکار
سچ یہ ہے کہ یہ بات طرحدار بہت ہے

اَفراد سے اَقوام کو لگ جاتا ہے یہ روگ
جو شخص بھی تم سا ہے وہ بیمار بہت ہے

شورش میں کبھی وسعتِ کونین بھی ہے تنگ
وحشت میں کبھی حلقۂ دیوار بہت ہے

ناموسِ وفا میں کہیں ہر جامہ ہے بے کار
رِندی میں کہیں شیخ کی دستار بہت ہے

ہر وقت کا دَھڑکا ہے نہ دن اپنے نہ راتیں
واماندگئ اندک و بسیار بہت ہے

کچھ اپنی اَنا کے لئے تسکین ہے شامل
کچھ یہ ہے کہ بَدخواہئ اغیار بہت ہے

اِک سمت یہ احباب کی ہے متفقہ رائے
اِک سمت تیری وحدتِ تنویر و کرم ہے

اِک سمت ہے دانش کا تقاضا بھی بڑی چیز
اِک سمت تری نیم نگاہی بھی ستم ہے

اِک سمت ہے نقارۂ الزام و حقارت
اِک سمت دلِ سوختہ ساماں کا بھرم ہے

اِک سمت چھلکتی ہے رگِ ساز پہ محفل
اِک سمت اداسی ہے، تری آنکھ کا نم ہے

اِک سمت ہے بپھرے ہوئے اغیار کی یورش
اِک سمت وہ سہما ہوا آہوئے حرم ہے

اِک حلقۂ احباب سے چھٹ جائیں تو چھٹ جائیں
ہم کو انہی سہمی ہوئی آنکھوں کی قسم ہے!

ایک زخمی تصوّر

یہ ترا عزمِ سفر یہ مرے ہونٹوں کا سکوت
اب تو دنیا نہ کہے گی کہ شکایت کی تھی!

میں سمجھ لوں گا کہ میں نے کسی انساں کے عوض
ایک بے جان ستارے سے محبّت کی تھی

اک دمکتے ہوئے پتھر کی جبیں چومی تھی!
ایک آدرش کی تصویر سے اُلفت کی تھی!

میں نے سوچا تھا کہ آندھی میں چراغاں کر دوں
میں نے چاہا تھا کہ سیلاب کو انساں کر دوں

ولولے دوش پہ لائے تھے سمندر کا جلال
حوصلے ڈال رہے تھے مہ و انجم پہ کمند

عزمِ آغاز سے مخمور، جنوں سے سرشار
فکرِ انجام کے غرفے تھے بڑی دیر سے بند

میں سمجھتا تھا کہ یہ جذبۂ بے نام و نمود!!
شیشۂ ذہن سے نازک ہے تصوّر سے بلند

آج ہر پھول لہو ہے کہ بکھرنا ہوگا
حوصلے سر بہ گریباں ہیں کہ اب کیا ہوگا

صرف لمحوں کی بدلتی ہوئی تصویریں ہیں
اجنبی تیرے تصور سے عبارت ہے حیات

تجھ سے وابستہ ہیں وہ کرب کی راتیں جن میں
حدّتِ غم سے سلگتے رہے بے بس لمحات

ذہن کی لو سے الجھتا رہا گہرا کہرا
دل کے ساگر سے ابلتے رہے اندھے جذبات

اب تو جب رات کو پچھلے کا سماں ہوتا ہے
اپنی آواز پہ رونے کا گماں ہوتا ہے

ایسی سنسان سڑک ! ایسا گھنا سناٹا !
کون جذبات کی لہروں میں اتر سکتا ہے

لوگ کہتے ہیں کہ اجڑی ہوئی آبادی سے
رات کے وقت گذرتے ہوئے ڈر لگتا ہے

مقبروں پر نظر آتے ہیں بھیانک سائے
موڑ پر دل کے پراسرار کھنڈر پڑتا ہے

اس اندھیرے میں ستارے تو کہاں ملتے ہیں،
کچھ سلگتے ہوئے اشکوں کے نشاں ملتے ہیں

آج لیکن مری آنکھوں میں کوئی اشک نہیں
تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کا فسانہ بھی نہیں

روح پر بوجھ ہے اک قبر کی مانند مگر!
نوحۂ دل بھی نہیں آہِ شبانہ بھی نہیں

میری ویران نگاہیں، مرا بے جان سکوت
زیست کو ہیچ سمجھنے کا بہانہ بھی نہیں

لیکن اس زیست میں ہے زیست سے بیزاری بھی
زخمِ دل یوں تو ہے خوشرنگ مگر کاری بھی

رقیب

سنا تم نے زیدی کا کردار کیا ہے
ثناخوانِ ابلیس و بدخواہِ یزداں

وہ خانہ بدوشے زِ خانہ بدوشاں
وہ آوارہ گردے زِ آوارہ گرداں

وہ مصروفِ طاعت گذاریٔ نغمہ
وہ محوِ سجودِ نگارانِ رقصاں

وہ جس کا تکلّم ، وہ جس کا ترنم
حدی خوئے کاروانِ حسیناں

سنکتا ہوا خود فریبی کا بادل
گرجتا ہوا جہل و وحشت کا طوفاں

نمازوں میں دیکھا نہ روزوں میں دیکھا
نہ صبحوں کو خنداں نہ راتوں کو گریاں

کبھی انقلاب اور بغاوت کا شعلہ
کبھی دودِ گرمِ دلِ نازنیناں

نہ اندازِ حکمت نہ آثارِ دانش!
فقط عکسِ مہ پارۂ مہ جبیناں

نہ لہجہ ہی ساکن نہ نغمہ ہی مدھم
فقط برق و آتش فقط ابر و باراں

اسے کیا ثواب و طہارت سے مطلب
وہ شاہِ صبوحی شہنشاہِ رنداں

یہی ہے تمہارے پجاری کا چٹھا؟
یہی ہے وہ سرکردۂ خوشہ چیناں؟

یہی ہے وہ شہ پارۂ آلِ سیّد؟
یہی ہے وہ تفسیرِ خونِ شہیداں؟

یہی ہے وہ نازشِ گرِ ہوش و تمکیں؟
یہی ہے وہ پروردۂ ابر و باراں؟

یہی ہے وہ جس سے محبت کا سینہ
فروزاں فروزاں چراغاں چراغاں؟

یہی ہے حریف نجوم و کواکب ؟
یہی ہے مثال مہ و مہر تاباں ؟

یہی ہے کلاہ شہنشاہ خاور ؟
یہی ہے وہ تابندگی کا سلیماں ؟

یہی ہے کہ جس کی قلم رو میں آکر
ہر اک حرف روشن ہر اک لفظ رقصاں ؟

یہی ہے شرر ریزیٔ رنگ و رونق ؟
یہی ہے گہر باریٔ ابرِ نیساں ؟

یہی ہے دماغ و کفِ اہلِ دانش ؟
یہی ہے دل و دیدۂ دل نشیناں ؟

یہی ہے وہ قرطاس پر عکسِ عظمت ؟
یہی ہے وہ گفتار میں لطفِ الحان ؟

کہاں یہ تمہاری محبت کے قابل
تم اس شخص کو بھول جاؤ مری جاں

اور اس بات کو جب کئی دن گزر لیں
تو اے صدرِ بزمِ نگارانِ دوراں

مری سمت بھی اک نگاہِ عنایت!
مرے ساتھ بھی ایک چھوٹا سا پیماں!

رُوح کی موت

چمک سکے جو مری زیست کے اندھیرے میں
وہ اک چراغ کسی سمت سے اُبھر نہ سکا

یہاں تمہاری نظر سے بھی دیپ جل نہ سکے
یہاں تمہارا تبسّم بھی کام کر نہ سکا

لہو کے ناچتے دھارے کے سامنے اب تک
دل و دماغ کی بے چارگی نہیں جاتی

جنوں کی راہ میں سب کچھ گنوا دیا لیکن
مرے شعور کی آوارگی نہیں جاتی

جُدائی

نگارِ شامِ غم مَیں تجھ سے رخصت ہونے آیا ہُوں
گلے مِل لے کہ یوں مِلنے کی نوبت پھر نہ آئے گی
سرِ راہے جو ہم دونوں کہیں مِل بھی گئے تو کیا
یہ لمحے پھر نہ لَوٹیں گے یہ ساعت پھر نہ آئے گی

جَرس کی نغمگی آوازِ ماتم ہوتی جاتی ہے

غضب کی تیرگی ہے راستہ دیکھا نہیں جاتا
یہ مَوجوں کا تلاطُم یہ بھرے دریا کی طُغیانی
ذرا سی دیر میں یہ دھڑکنیں بھی ڈوب جائیں گی
مری آنکھوں تک آ پہنچا ہے اب بہتا ہُوا پانی

تِری آواز مدّھم ــــ اور مدّھم ہوتی جاتی ہے

تہذیب

(ایک تمثیل)

شہر میں غُل تھا کہ بنگال کا ساحر آیا
مصر و یونان کے اہرام کا سیاحِ عظیم
چین و جاپان کے افکار کا ماہر آیا

ایک ٹیلے پہ طلسمات کا پہرہ دیکھا
میں نے بھی دل کے تقاضوں سے پریشاں ہو کر
آخر اُس ساحرِ طنّاز کا چہرہ دیکھا

کتنا مغرور تھا اُس شخص کا مضبوط بدن
کتنا چالاک تبسّم تھا جواں ہونٹوں پر
کیسے رہ رہ کے لپک جاتی تھی آنکھوں میں کرن

کتنا مرعوب تھا ہر فرد مری مِلّت کا
ڈرتے ڈرتے جو چھُوا مَیں نے تو یہ راز کھُلا
وہ فقط موم کا اک خوف زدہ پُتلا تھا

نوروز

شام کی مانگ سے افشاں کی لکیریں پھوٹیں
جشنِ نوروز میں دھرتی کے دریچے جاگے
سُرخیاں چونک اُٹھیں، تیرگیاں ڈوب گئیں
تم بھی جاگو کہ اُفق پر کہیں مہتاب نہیں
تم بھی جاگو کہ یہ اعلانِ سحر خواب نہیں

درد کا بوجھ بھی تھا، بارشِ الزام بھی تھی
میرے دُکھ درد کی ساتھی، مری خوشیوں کی شریک
جُرعۂ شہد میں کچھ تلخیٔ ایّام بھی تھی
پھر بھی ہم لوگ سویرے کی تمنا لے کر
رات سے، تلخیٔ ایّام سے لڑتے ہی رہے
یوں تو اب بھی ہیں پُر اسرار تمھاری آنکھیں
اب سے پہلے مگر اِن آنکھوں میں ہیجان بھی تھا
ساز کی لہر بھی تھی، سوز کا طوفان بھی تھا

اب مگر جھومتی گاتی ہُوئی آنکھوں کا نصیب
ساز کی لہر تو ہے، سوز کا طُوفان نہیں
ریشمی ڈورے لچکتے ہیں بکھر جاتے ہیں
نیم خوابیدہ اُداسی سے ہے صُبحوں پہ مُحیط
اوس کا ذائقہ ہونٹوں پہ جما جاتا ہے
تشنگی اوس کے قطروں سے نہیں بُجھ سکتی
جاگ بھی جاؤ کہ یہ نیم نگاہی بے سُود
جاگ بھی جاؤ کہ سوتے ہُوئے ہونٹوں پہ مجھے
جانے کیوں موت کا رہ رہ کے خیال آتا ہے
اَبَدیّت کے کئی راز بہت یکساں ہیں!
حُسن اور موت کے انداز بہت یکساں ہیں
جاگ بھی جاؤ کہ اِنسان کی قِسمت میں نہیں
آج بھی وقت کو ہم سازِ شبستاں کرنا
حُسنِ وِجدان کی تذلیل ہُوا کرتے ہیں
گاؤں جب شہر میں تبدیل ہُوا کرتے ہیں
مُفلِسی دیہات کے سِکّوں کو جنم دیتی ہے
زندگی موت کے بھکلوں کو جنم دیتی ہے

رُوحیں تہذیب کے شعلوں سے پگھل جاتی ہیں
کونپلیں ریل کے پہیوں میں کچل جاتی ہیں
قمقمے جلتے ہوئے گوشت کی بُو دیتے ہیں
اسپتالوں کو جراثیم نمُو دیتے ہیں
خون بھی ملتا ہے ہوٹل میں رگِ تاک کے ساتھ
عمداً زہر دیا جاتا ہے خوراک کے ساتھ
اُسی منڈی میں جہاں صاف کفن بِکتا ہے
جسم بکتے ہیں، ادب بکتا ہے، فن بکتا ہے
شورشیں کرتی ہیں خاموش فضا میں پرواز
بم گراتے ہیں اندھیرے میں فرشتوں کے جہاز
زندگی گیس نگلتی ہے، ہوا پھانکتی ہے
رشتے داروں کی نگاہوں سے ریا جھانکتی ہے
دل پہ ڈگری کا فسوں چلتا ہے تیروں کے عوض
چور بازار میں جو ملتا ہے ہیروں کے عوض
دھڑکنیں دل کی مزاروں کو ضیا دیتی ہیں
عصمتیں ریشِ مقدس کو دعا دیتی ہیں

کون بن سکتا ہے سُنسان کُنوؤں کا ھمراز
کون سُنتا ہے سمندر میں رَببط کی آواز
کون سا کَیف ہے دیہات کے رومانوں میں
کِس کو لُطف آئے گا چوپال کے افسانوں میں
کوئی بھی دَولتِ لمحات نہیں کھو سکتا
کوئی بھی دار کے سائے میں نہیں سو سکتا
دار کی چھاؤں میں سوتے ہُوئے ہونٹوں پہ مجھے
جانے کیوں موت کا رہ رہ کے خیال آتا ہے
یہ نہیں ہے کہ مرے واسطے انجامِ حیات

اِتنا پُر ہول تصوّر ہے کہ مَیں ڈرتا ہُوں
یہ نہیں ہے کہ مصائب سے ہراساں ہو کر
مَیں تخیُّل کے طَرَب زار کا دم بھرتا ہُوں
موت تو میرے لیے ایک تاثُّر ہے جسے
اک نہ اک روز ھم انسان دبا ہی لیں گے
اِس دکھاوے کے تمدُّن سے نکل کر اک روز
اپنے انجام کے اِس راز کو پا ہی لیں گے

مجھ کو تو صرف یہ کہنا ہے کہ اِس عالم میں
مجھ کو اک لمحۂ بیدار کی قوّت دے دو
مجھ کو سوتے ہُوئے ہونٹوں پہ ترس آتا ہے
کوئی فنکار، کوئی زندہ مُصوّر ہرگز
حُسنِ خوابیدہ سے اِنکار نہیں کر سکتا
اور میں! جس نے اِن آنکھوں کی پرستش کی ہے
جس نے ان ہونٹوں کو انکار میں بھی پُوجا ہے
کس طرح اپنے مُقدّر کو بُرا کہہ دُوں گا؟
تم کو اس کا بھی پتہ ہے کہ وہ تہذیب جسے
میں نے قصبوں کی تباہی کا سبب سمجھا ہے
اپنے ہر نقص کے با وصف بری اپنی ہے
جس کو افراد نے تخریب بنا رکھا تھا
درحقیقت وُہی تعمیر کی بُنیاد بھی ہے
کوئی بھی مُلک تمدّن سے ہراساں ہو کر
اپنی فطرت کو نہ سمجھا نہ سمجھ سکتا ہے
کوئی بھی دیس سِسکتا ہُوا چرخہ لے کر
زیست کی جنگ میں اُبھرا نہ اُبھر سکتا ہے

لعنتیں یُوں تو مشینوں کی بہت ہیں لیکن
لعنتیں صرف مشینوں سے نہیں اُگتی ہیں
اِن میں اُس مُلک کا بھی ہات ہُوا کرتا ہے
جس میں کچھ لوگ خود اپنی ہی بقا کی خاطر
دُوسرے لوگوں کے انفاس چُرا لیتے ہیں
اور اس دَوڑ کی رفتار میں اندھے ہو کر
قحط پڑتا ہے تو کھلیان جلا دیتے ہیں

چھین سکتا ہے ان افراد کی قُوّت جو نظام
صرف اُس میں ہی پھپک سکتے ہیں تیزی سے عوام
صرف اُس میں ہی اُگلتی نہیں لاوا تہذیب
صرف اُس میں ہی نکھرتے ہیں بہاروں کے نصیب
رقص ہوتا نہیں دیوانوں کی تلواروں کا
کرنیں مُنہ چُومنے آتی ہیں سمن زادوں کا
ٹینک بڑھتے نہیں دامن میں تباہی لے کر
پُھول ہنس پڑتے ہیں ڈھیرے سے جماہی لے کر

بھائی اب زہر نہیں ڈھونڈتے بھائی کے لیے
دھارے مُڑ جاتے ہیں کھیتوں کی سنچائی کے لیے
ریت کے بطن سے ہوتے ہیں نظارے پیدا
سنگ کے سینے سے ہوتے ہیں شرارے پیدا
کارخانوں میں تمدّن کو بقا ملتی ہے
چمنیاں زہر کے انبار اُگلتی بھی نہیں
گاؤں بھی شہر میں ہو جاتے ہیں تبدیل مگر
رُوحیں تہذیب کے شعلوں سے پگھلتی بھی نہیں

میرے دُکھ درد کی ساتھی، مری خوشیوں کی شریک
شام کی مانگ سے افشاں کی لکیریں پھوٹیں
آؤ ہم لوگ بھی اک عزم سے اک ہمّت سے
اپنے بیتے ہُوئے حالات کو ٹھکرا کے چلیں
اپنی فرسُودہ روایات کو ٹھکرا کے چلیں
جشنِ نوروز کو گیتوں کی ضرورت ہوگی
آؤ ہم ریت پہ وُہ نقشِ قدم چھوڑ چلیں
جن کی آتی ہوئی نسلوں کو ضرورت ہوگی

اقوامِ مُتّحدہ

تم میں کیا کچھ نہیں ؟ احساس ،شرافت ،تہذیب
مجھ میں کیا ہے ؟ نہ بصیرت ، نہ فراست، نہ شعُور

تم جو گزرے بہ صد انداز و ہزاراں خوُبی
سب نے سمجھا کہ چلو رات کٹی ، دن آیا

مَیں تو اُن تیرہ نصیبوں میں پلا ہُوں جن کو
تم سے وہ ربط تھا جو بھوک کو اخلاق سے ہے

ایسی دُزدیدہ نگاہوں سے ہمیں مت دیکھو
ہم تو پہلے ہی بِچھے بیٹھے ہیں اے جانِ بہار

مور کا پنکھ لگاتے ہی تھرکنے لگے پاؤں
سادہ لوحی پہ کوئی شرط ، کوئی زور نہیں

تم نے کس پیار سے یہ بات ہمیں سمجھائی
کہ یہاں تو کوئی ظالم ، کوئی کمزور نہیں

مختلف نُقطوں سے چلتے تو ہیں دُنیا والے
کُرۂ ارض مگر گول ہے چوکور نہیں

آئینہ خانۂ تصوّر میں

مَیں آنکھیں بند کیے سوچتا رہا لیکن
نہ حافظے نے مدد کی، نہ مرنے والوں نے
ہر ایک سالگرہ موم بتّیوں کی طرح
پگھل کے رہ گئی تاریخ کے اندھیروں میں
خیال ہے کہ اک ایسا بھی موڑ آیا تھا
جب انتظار کی ہر بے کراں اندھیری رات
ترے خیال کی آہٹ سے چونک جاتی تھی
ترے لبوں کی عنایات سے بہت پہلے
ترے لبوں کے تصوّر سے آنچ آتی تھی

نہ جانے کون سے لمحے نے مجھ کو چھین لیا
نہ جانے کون سی ساعت تری رقیب بنی

اک ایسا غم تھا شبستانِ جسم و جاں پہ مُحیط
جو تیرا غم بھی نہیں تھا، غمِ جہاں بھی نہیں
مرا دیارِ تمنّا ضرور تھا، لیکن
دیارِ دل بھی نہیں تھا، دیارِ جاں بھی نہیں
خوشی بھی تھی کہ یہ سرحد خوشی سے آگے ہے
فغاں بھی تھی کہ یہ معمورۂ فغاں بھی نہیں

مری رگوں میں لہُو بن کے رچ گئی تھی وُہ نیند
ترے بدن کی حلاوت نے جس کی باہوں میں
زمانے بھر کی پُر اسرار خُنکیاں رکھ دیں
تری نگاہ کی شفقت نے جس کی پلکوں پر
لطیف، نرم، ملنسار اُنگلیاں رکھ دیں

اور اس ڈھلے ہُوئے لمحے میں، ایک ساعت میں
تری وفا، تری آغوش کی حلاوت میں
کِسی نے جیسے مرے دونوں ہات تھام لیے

اُفق کے بعد اُفق آئے ، رنگ رنگ کے دیس
چمکتے ، کوندتے ، سیماب کی طرح بے تاب
نہ آسمان ، نہ دھرتی کا گھومتا چکّر
نہ ماہتاب کے ٹکڑے ، نہ ریت کے ذرّے
کوئی زمیں بھی نہیں تھی ، کوئی زماں بھی نہیں
دیارِ دل بھی نہیں تھا ، دیارِ جاں بھی نہیں

یہاں بھی ویسے ہی اِنسان تھے جنھیں مَیں نے
زمیں پہ چھوڑ دیا تھا ، مگر یہاں میرے
اور اُن کے بیچ میں، آئینۂ جمال نہ تھا
سیاہ آنکھوں کے بدلے ، جواں لبوں کے عوض
ہر ایک شکل کھڑی تھی کوئی دُکان سجائے
ہر ایک شکل سے آتی تھی دم بہ دم آواز
"گھڑی ، پُرانی قمیصیں ، دوائیں ، سگرٹ ، چائے"

دوراہہ

جاگ اے نرم نگاہی کے پُراسرار سکوت
آج بیمار پہ یہ رات بہت بھاری ہے
جو خود اپنے ہی سلاسل میں گرفتار رہے
اُن خداؤں سے مرے غم کی دوا کیا ہوگی
سوچتے سوچتے تھک جائیں گے نیلے ساگر
جاگتے جاگتے سو جائے گا مدّھم آکاش
اِس چھلکتی ہُوئی شبنم کا ذرا سا قطرہ
کِسی معصُوم سے رُخسار پہ جم جائے گا
ایک تارا نظر آئے گا کِسی چلمن میں
ایک آنسُو کسی بستر پہ بکھر جائے گا
ہاں مگر تیرا یہ بیمار کدھر جائے گا

مَیں نے اِک نظم میں لکھّا تھا کہ اے رُوحِ وفا
چارہ سازی ترے ناخُن کی رہینِ منّت
غم گُساری تری پلکوں کی روایات میں ہَے
ایک چھوٹی ہی سی اُمّیدِ طرب زار سہی
ایک جگنو کا اُجالا مری برسات میں ہَے
لذّتِ عارض و لب ، ساعتِ تکمیلِ وصال
میری تقدیر میں ہَے اور ترے ہات میں ہَے

دَیر سے ، کعبے سے ، اِدراک سے بھی اُکتا کر
آج تک دِل کو اُجالے کی طلب ہوتی ہَے
ایک دن آئے گا جب اور بھی عُریاں ہو کر
آدمی جینے کو تھوڑی سی ضیا مانگے گا
گیت کے ، پھُول کے ، اشعار کے ، افسانوں کے
آج تک ہم نے بنائے ہَیں کھلونے کتنے
یہ کھلونے بھی نہ ہوتے تو ہمارا بچپن
سوچتا ہوں کہ گُزرتا تو گُزرتا کیسے

آدمی زیست کے سیلاب سے لڑتے لڑتے
بیچ منجدھار میں آتا تو اُبھرتا کیسے

دیر سے رُوح پہ اک خوابِ گراں طاری ہے
آج بیمار پہ یہ رات بہت بھاری ہے
آج پھر دوشِ تمنّا پہ ہے دل کا تابُوت
جاگ اے نرم نگاہی کے مسیحانہ سکُوت
ورنہ اِنسان کی فطرت کا تلوّن مت پُوچھ
اِس سِن و سال کا مغرُور لڑکپن مت پُوچھ
آدمی تیری اس اُفتاد سے بد دِل ہو کر
اور دو چار خداؤں کے علَم پُوجے گا
اور اِک روز اس انداز سے بھی اُکتا کر
اپنے بے نام خیالوں کے صنَم پُوجے گا

پرچھائیاں

اب سے پہلے بھی یہ تُلسی کا ذرا سا پودا
اسی مندر کے کلیجے سے لگا بیٹھا تھا
اب سے پہلے بھی یہ برگد کا پُر اسرار درخت
گاؤں والوں کے عقائد کو بہت پیارا تھا

اب بھی چوپال کے جینے کا پتہ دیتی ہیں
بیل گاڑی کے چٹختے ہُوئے پہیّوں کی رگیں
نہ کوئی وقت کی قلّت نہ گریزاں لمحے
وہی گو ڈھول ، وہی ہم ، وہی کچّی سڑکیں

ہارڈی کی نظم In times of the breaking of Nations سے متأثر ہوکر

حسبِ معمول خطرناک بِھڑوں کے چھتّے
بے خطر طاقوں کو آباد کیے بیٹھے ہیں
حسبِ معمول بڑے کُنْبوں کے دو چار بزرگ
ایک لاچار سے حُقّے کو لیے بیٹھے ہیں

نیم کے پیڑ ہیں ٹُوٹی ہُوئی قبروں کے قریب
ایک تاریخ ہے اُجڑی ہوئی محرابوں میں
ڈھیر کے ڈھیر ہیں گدرائی ہُوئی جامن کے
آم کی ٹوکریاں بہتی ہیں تالابوں میں

اُسی لُو دُھوپ اُسی سخت اُمَس کے باوصف
اب بھی منگل کو یہاں پینٹھ لگا کرتا ہے
سیکڑوں بار سُنائے ہُوئے اک قِصّے کو
اب بھی اِک شخص بدستور کہا کرتا ہے

۵ گاؤں کا بازار

اور اس شخص کی آنکھوں میں بدستور ابھی
وہی بیزار سی ، اندھی سی چمک باقی ہے
اُس کی داڑھی پہ ڈھلک جاتے ہیں اب تک آنسو
اُس کے چہرے پہ وہی غم کی کسک باقی ہے

ایسا لگتا ہے کہ دُنیا کے اُفق زاروں پر
آج تک جنگ کے بادل کبھی منڈلائے نہیں
ایسا لگتا ہے کہ شہروں سے کبھی ڈان ژُوان
اِن اُلجھتی ہُوئی راہوں کی طرف آئے نہیں

جانے کب تک رہے یہ دُودھ سی بے داغ فضا
جانے کس وقت یہ خوابوں کی عمارت ڈھ جائے
اور تُلسی کا یہ مغرور ذرا سا پودا
تیز کرنوں کی تمازت میں سُلگ کر رہ جائے

زندگی، مَیں ترے دروازے پر
اک بھکاری کی طرح آیا تھا
اپنے دامن کو بنا کر کشکول
تیری ہر راہ پہ پھیلایا تھا

ایک مرحوم کرن کی خاطر
مُجھ کو تھوڑی سی ضیا بھی نہ مِلی
دم بہ دم ڈُوبتے سیّارے کو
اپنے مرکز سے صدا بھی نہ مِلی

دفعتاً ایک دھماکے کے ساتھ
کچّے دھاگوں کے سِرے چھوٹ گئے
اُنگلیاں چِھل گئیں ارمانوں کی
یک بہ یک تارِ نفس ٹوٹ گئے

اور پھر ایک گھنا سنّاٹا
اور پھر رسمِ کُہن کے گیسُو
کچھ دِلاسے کی زبانی باتیں
کچھ دکھاوے کے پُرانے آنسُو

۲

گھر میں ڈُوب گئی تھیں شمعیں
وقت ناراض تھا قِسمت کی طرح
رات کے رُخ پہ تھے زخموں کے نشان
میری مجرُوح حمیّت کی طرح

اک خطرناک کگارے کے قریب
تجھ سے لڑنے کا ارادہ لے کر
مَیں نے لہروں کو سکھائی شورش
مَیں نے مَوجوں کے بگاڑے تیور

تو، مگر آئی تو اک لمحے میں
نہ وہ تیور تھے نہ وُہ آہیں تھیں
تیرے عارض پہ مرے آنسو تھے
میری گردن میں تری باہیں تھیں

میں امن چاہتا ہوں

شکنتلا تم بتا سکو گی
میں کتنے اشکوں کو اپنی پلکوں میں روک کر مسکرا رہا ہوں
مرے شکستہ اداس بربط کے تار ٹوٹے ہوئے پڑے ہیں
مگر میں اب تک اسی مسرّت کی چھاؤں میں گنگنا رہا ہوں
شکنتلا تم بتا سکو گی، میں رو رہا ہوں کہ گا رہا ہوں

تمہاری باتیں مرے ہر اک گیت کے لبوں پر اتر چکی ہیں
تمہاری راکھی مری کلائی میں آج بھی جگمگا رہی ہے
تم اپنے بھائی کی بات رکھ لو

تمہارا بھائی خلوص کی بھیک کے لیے دربدر گیا ہے
اُسے محبّت بھی مل چکی ہے
اُسے ہزاروں دلوں سے اک بیکراں عقیدت بھی مل چکی ہے
نگار خانے بھی سج چکے ہیں
چھلکتے نغموں کی بزم پر سبز شامیانے بھی سج چکے ہیں
مگر ابھی تک وُہ دِل کی بے لوث چاندنی کو ترس رہا ہے
اُسے رفاقت نہیں ملی ہے
اُسے محبّت تو مل چکی ہے، مگر صداقت نہیں ملی ہے

میں اکثر اوقات ذہن کی بے پناہ الجھن میں سوچتا ہُوں
یہاں صداقت کہاں ملے گی؟
یہ چاند کے خوشگوار چہرے کے گرد اِتنے اُداس ہالے
یہ دُور سے نَو عروس کمرے، یہ پاس سے مکڑیوں کے جالے
اُڑان کے بعد اس کا رونا کہ بال و پر میں تو کچھ نہیں ہے
یہ سرج کے سُوٹ اور یہ سوچنا کہ گھر میں تو کچھ نہیں ہے
یہ چند پیسوں کے واسطے مکر کس لیے ہیر پھیر کیوں ہے

یہ چھوٹے چھوٹے گھروں میں سِل اور دق کے کیڑوں کا ڈھیر کیوں ہے،
خُدا کے فضل و کرم سے ہم آج بھی اُجالے سے ڈر رہے ہیں
ہماری نسلیں، ہمارے بچّے غلاظتوں میں اُبھر رہے ہیں
یہاں صداقت کہاں مِلے گی ؟

تمہارے کمرے کی جتنی چیزیں ہیں مجھ کو حیرت سے دیکھتی ہیں
یہ اجنبی تو نہیں ہے کوئی !
مگر نہیں، آئینے میں خود میری اپنی صُورت جھلک رہی ہے
یہ عکس میرے ہی جسم کا ہے
یہ نرم چنگاریاں مرے اپنے ساز ہی سے نکل رہی ہیں
مگر مجھے آج اس کا ڈر ہے
کہیں یہ چنگاریاں ہی کمرے کی رونقوں کو جلا نہ ڈالیں
کہ اُن کی معصُوم پھُلجھڑی میں دہکتے لمحوں کی آنچ بھی ہے
دہکتے لمحے جو آچکے ہیں

دہکتے لمحے جو دُوسری جنگ کے زمانے میں آچکے ہیں
دہکتے لمحے جو خیر سے اپنے مُلک میں دور ہی پہ ناچے
جنھوں نے بنگال کی زمیں پہ ہی اکتفا کی
اگر کہیں پھر یہ آگ لپکی
تو اس کی زد سے ہماری تہذیب کی بہاریں نہ بچ سکیں گی
تمھیں تو یہ بات یاد ہوگی
کہ دُوسری جنگ ہی میں پانی کے بدلے کیچڑ پیا گیا ہے
غذا کے بدلے سپاہیوں کو نجاستیں پھانکنی پڑی ہیں
شکستگی، بے بسی میں چمڑے کی پیٹیاں چاٹنی پڑی ہیں
ہزاروں مائیں جوان بچّوں کے واسطے خون رو چکی ہیں
ضعیف باپوں کے تھرتھراتے ہُوئے قدم سرد پڑ چکے ہیں
سُہاگنوں کی نگاہیں دُولھا کی واپسی کو ترس چُکی ہیں
سِسکتی بہنوں نے بھائیوں کو کفن پہنا کر جُدا کیا ہے!

اگر پھر اس بار جنگ ہوگی
تو آدمیّت نکیلے بوٹوں کی ٹھوکروں سے لرز اُٹھے گی

تمہارے گھر کے برآمدے میں چٹختی اینٹوں کے ڈھیر ہوں گے
تمہارے شوہر کا جسم سیسے کی گولیوں سے فگار ہوگا
تمہاری بچّی سے لوگ اُس کی ذرا سی گُڑیا بھی چھین لیں گے
تمہارے بچّے کے ہات میں دُودھ کا کٹورا نہیں رہے گا
تمہاری الماریوں پہ رکھّی ہُوئی کتابیں نہیں رہیں گی
تمہارے چُولھے میں لکڑیوں کے عوض تمہارا بدن جلے گا
تمہاری اپنی زمیں جلے گی، تمہارا اپنا وطن جلے گا
تمہارے چھجّے پہ کانچ کی چُوڑیوں کے ٹکڑے نہیں رہیں گے
تمہارے آنگن کی رسّیوں پر سفید کپڑے نہیں رہیں گے
تمہارے بھائی کا ساز گِر جائے گا ستاروں کی آہ بن کر
تمہارے بھائی کے گیت جم جائیں گے تمہاری کراہ بن کر

یہ بات تم تک نہیں رہے گی
یہ زہر دھرتی کی ایک اک نس میں گُھل کے ہر حبّہ کو کاٹ دے گا
یہ زہر رگ رگ کو چاٹ لے گا
زمین گیہوں نہیں جنے گی

کہ اُس کے ہونٹوں پہ آدمی کے لہُو سے پپڑی جمی ہُوئی ہے

ملوں میں کپڑا نہیں بنے گا

کہ تکلیوں کو گھمانے والوں کی اُنگلیاں کاٹ دی گئی ہیں

اور اب کے وہ اسلحے بھی ہوں گے

زمین ہی کو نہیں جو گہرے سمندروں کو بھی راکھ کر دیں

اذیّتیں جن کو سوچنے ہی سے آدمی کانپ کانپ اُٹھّے

ہزاروں بم جو لہکتے کھیتوں کو خاک کر دیں، جلا کے رکھ دیں

ہزاروں گیسیں جو آدمی کے بدن کی ہڈّی گلا کے رکھ دیں

اُجاڑ سُنسان شاہراہوں پہ ڈگمگاتا ہُوا تمدُّن

سڑی ہُوئی آدمی کی لاشوں کے تیز بھبکوں سے جل اُٹھے گا

لہو کی بھٹّی میں گرم تانبے کے سُرخ سکّے ڈھلا کریں گے

سمندروں کی عظیم لہروں میں تارپیڈو چلا کریں گے

جنُوں کے جبڑوں میں پس کے رہ جائیں گی نئی ہونہار نسلیں

امیر خسرو کے مقبرے میں اگر کی بتّی نہیں جلے گی

عظیم غالب کے اُجڑے مسکن میں بیر کے پیڑ بھی نہ ہوں گے

کبیر کے بے پناہ دوہوں کے گانے والے نہیں رہیں گے

کرشن اور پریم کی کہانی کو باڑھ کے تار گھیر لیں گے
فراق اور جوشؔ کا ترانہ بکھر کے رہ جائے گا خلا میں

یہ بمبئی کے حسین ساحل
سجی ہوئی لکھنؤ کی سڑکیں
دُھلی ہوئی تاج کی عمارت
وسیع دِلّی میں اوکھلا اور چاندنی چوک کے مناظر
اِنہی مناظر پہ آدمی کے لہُو سے صبح و مسا بنیں گے
اِنہی مناظر پہ جانے کتنے تباہ ہیروشیما بنیں گے
اودھ کی شامیں دراز زُلفوں کی یاد میں مضمحل رہیں گی
جوان کاشی کی صُبح ڈھونڈے گی اور مانجھی نہیں ملیں گے
اُداس سنگم کے گیت نوحوں کے رُوپ میں چیختے پھریں گے
ہوائیں ٹکرائیں گی درختوں سے جیسے رُوحیں بھٹک رہی ہوں
درخت ٹکرائیں گے چٹانوں سے جیسے شمشان جل رہے ہوں
چٹانیں ٹکرائیں گی خلاؤں سے جیسے بھونچال آ رہا ہو

میں آدمیت کو پُوجتا ہوں

مرے ترانوں میں قوس اور کہکشاں کی انگڑائیاں نہیں ہیں
مری عقیدت زمین کے ایک ایک ذرّے کو چومتی ہے
مَیں جانتا ہوں کہ آج فطرت پہ جبیت انسان ہی کی ہو گی
عظیم انسان جس نے اپنے پُرانے کپڑے بدل دِیے ہیں
جو ارتقا کے کروڑوں زینوں کو آج تک پار کر چُکا ہے
مَیں ڈر رہا ہوں کہیں یہ رفتار جنگ سے سُست ہو نہ جائے
اُٹھو مقدس زمین سے ہم تمام انسان عہد کر لیں
کہ اپنے اس تیز ارتقا کے لیے ہمیں جنگ روکنی ہے
یہ عہد جس روز جنگ بازوں سے اپنا لوہا منا سکے گا
تمام سنسار گا سکے گا
ہماری نسلیں، ہمارے بچّے نفاستوں میں اُبھر سکیں گے
یہاں رفاقت بھی مِل سکے گی
یہاں صداقت بھی مِل سکے گی

آں دِلے کہ ما داریم

صبا کے ساتھ ہمارا خرام بھی ہوگا
کبھی تو عصرِ رواں تیز گام بھی ہوگا
ہرا ہے زخمِ جگر، لالہ فام بھی ہوگا

تمہاری سال گرہ پر خواص آتے تھے
سُنا ہے اب کی برس جشنِ عام بھی ہوگا

ہماری نظم کی سارے جہاں میں شُہرت ہے
ہمارے ساتھ رہو گے تو نام بھی ہوگا

تمھارے وقت کا ٹھہرا ہُوا طلِسم کہاں
یہاں تو سلسلۂ صُبح و شام بھی ہوگا

فقیہِ شہر کی محفل عِشا کے بعد ہے آج
سُنا ہے رات کا کچھ انتظام بھی ہوگا

ہم آج جُملہ حسینوں میں بن گئے ہیں امام
کہیں تو کوئی ہمارا امام بھی ہوگا
کوئی فقیر قلندر مقام بھی ہوگا

گرب اسٹریٹ کی کہانی

(ایک فینٹیسزیا)

آ، اے جُنوں کہ ہم بھی جلائیں نئے چراغ

آ۔ اے خیال، ہم بھی ذرا دو قدم چلیں
اس اونگھتی سڑک کے کناروں کو چھوڑ کر
تاروں کو، جُوئبار کے دھاروں کو چھوڑ کر
آ اے جنوں کہ ہم بھی ---------

ابتدا:

"سودا پہ جب جُنوں نے کیا خواب و خُور حرام
لائے گھر اُس طبیب کے ہے عقل جس کا نام
احوال اس کا دیکھ کے کہنے لگے طبیب
اب فصد و مسہل اس کے لیے ہے مُفید تام"

خفگی :

سُنتے ہیں اک بزرگ نے اپنے مزار سے
شہنائیوں کا شور سُنا اور بگڑ گئے
ہاں دلبرو، اب اور نہ عُشّاق کو ستاؤ
اُس دن سے خوف کھاؤ کہ جب ہم اکڑ گئے

رنگِ سُخن :

گھوڑے کا حال لکھتا ہُوں حضرات ہوشیار
کاغذ پہ پہلے کرتا ہوں دو قافیے سوار
اک قافیہ بہار ہے، اک قافیہ شرار
اُس کے سُموں سے طفلکِ آفاق کو بُخار
اُس کی رگوں میں اپنے اَب وجد کا اضطرار
اک ریس میں تو ہار گئی اس سے فورڈ کار

ایک اور رنگِ سُخن :

برسوں حقیقتِ غمِ دَوراں کے باوجُود
آتی رہی شعُور سے چھَن کر صدائے دل

طرّار و تیز و نازک و کم عمر و کج کلاہ
اک حورِ شوخ و شنگ تھی فرمانروائے دل
ہم مطمئن رہے کہ چلو رات کٹ گئی
اک ٹوٹتی کرن نے پکارا کہ ہائے دل

افراد کا خیال کہاں انقلاب کو
اک تیغِ تیز سی اِدھر آئی اُدھر گئی
ہم جاگتے رہے تو کلی بھی نہیں کھلی
ہم سو گئے تو سر سے قیامت گزر گئی

مشرق سے آفتاب کی پہلی کرن اُٹھی
جیسے سہاگ رات کو سو کر دلھن اُٹھی
یوں دور رات صبح کے نرمی سے ہم خطاب
جیسے کسی حسینہ کی اُلٹی ہوئی نقاب
دریا کی لہر لہر پہ اُمڈی ہوئی اُمنگ
جیسے سپردگی میں جھکی انکھڑیوں کا رنگ

سیاسیات:

یہ اپنا ملک، کون سنائے اب اس کا حال
اس کے خداؤں کی نہیں ملتی کوئی مثال
ان کی وفا شعار نگاہوں میں پانچ سال
ایسے کٹے ہیں جیسے کسی کی شبِ وصال

محلّہ ہوشربا:

اے ناظرِ بہار ذرا اور غور کر
رنگِ شفق نہیں ہے، کسی کا گلال ہے
ہر شے کی پُشت پر ہے اِک حق آفریں دماغ
فطرت وجُودِ شاہدِ فطرت پہ دال ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
لیکن یہی تو باڈلیئر کا خیال ہے

طلسم:

غُل پڑ گیا ہے محفلِ افراسیاب میں
لو اوڑھ لی عُمر نے گلیم سُخن وری
سب ساحِروں کے خوف سے چہرے نڈھال ہیں

کب آئیں گی خُدائے لقا کی سواریاں
کب ہو گی اب عنایتِ جمشید و سامری
کیا کیا نہ رن پڑے مگر آساں گزر گئے
چھکّے چھڑائے دیتی تھی صاحبقراں کی جنگ
خیمے جلے، پہاڑ گرے، آندھیاں چلیں
شعُلوں کی پُتلیوں نے زبانیں نکال دیں
بدلا کبھی جو دُھوم سے ساحر نے اپنا رنگ
دریا میں ایک شیر تھا، جنگل میں دو نہنگ

جب بھی کسی حسینہ نے جھٹکے سیاہ بال
کتنے جوان مر گئے انداز دیکھ کر
کتنے تباہ ہو گئے پشواز دیکھ کر
انجام سوچ سوچ کے، آغاز دیکھ کر
خواجہ کو بھی دکھا کے جھلک ساقِ صاف کی
صرصر نے کتنی بار گرفتار کر لیا
خواجہ کا کیا قصور، اگر سارے اولیا

اِس سمت آنکلتے تو صر صر کو دیکھ کر
اک دُوسرے کی آنکھوں میں ناخُون مارتے
اک دُوسرے کی پُشت میں چُھریاں اُتارتے

لیکن وُہ اَور بات تھی، یہ اور بات ہے
اب چھوڑ دیں عُمر نے روایاتِ سابقہ
اب وُہ مُدیرِ خاص ہے دو پرچہ جات کا
جن میں چِھڑی ہے پہلی اشاعت سے جنگِ عام
وُہ دن گئے کہ رُعب سے افراسیاب کے
راتیں ڈراؤنی تھیں، تو دن تھے سیاہ فام
کاتب سے لے کے ناشرِ عالی مقام تک
خواجہ نے اس زمانے میں بدلے ہیں لاکھ نام

عیدیں منا رہی ہے بدیع الزّماں کی فوج
اِعلان ہو رہا ہے کہ اس رات ہر کنیز
خواجہ کے راستے میں بچھائے گی انکھڑیاں

ہم کیوں ملول و خستہ و با چشمِ نم چلیں
آ، اے خیالِ، ہم بھی ذرا دو قدم چلیں
آ، اے جنوں کہ ہم بھی ذرا دو قدم چلیں

فرار، شکست، انتقام وغیرہ وغیرہ

(ایک اور فینٹیسیزیا)

اچھّا ہُوا کہ رسمِ مُروّت بھی اُٹھ گئی
اچھّا ہُوا کہ آنکھ کا پانی بھی ڈھل گیا
تاروں میں جس خُلوص کے نکھرے تھے خدّوخال
وہ دن کی تیز دُھوپ میں آیا تو جل گیا

اک لمحہ جاوداں نہ اگر ہو سکا تو کیا
ہم کو شکستِ حرفِ تمنّا کا غم نہیں
آئینِ سنگباریٔ فطرت کا رنج ہے
شیشوں کے سوگوار مسیحا کا غم نہیں

اب یہ تو ہے کہ قصّۂ فرہاد پر ہمیں
وحشت نہ ہوگی ٹوٹ کے رونا نہ آئے گا
پروائے ننگ و نام رہے گی جو کل نہ تھی
دِل کو دیارِ غیر میں کھونا نہ آئے گا

احساس تو رہے گا کہ ہر ایک بات پر
ہم ہی غلط ہیں ، سارا زمانہ غلط نہیں
سینہ فگار ہے تو ہمارا قصور ہے
آقائے دو جہاں کا نشانہ غلط نہیں

ماضی کے قیس ، آج کے ہم دونوں سادہ لوح
اسٹیکل اور فرائڈ کے کردارِ عام ہیں
یکتائے روزگار نہیں ہم میں ایک بھی
ہم لوگ صرف اپنی نظر میں امام ہیں

ایک قطعہ اس سلسلے میں :

جسے چاہے اُسے دے آمریّت
متاعِ حُسن کی ناپیدی نہیں ہے
بہت ہے یُوں تو اُس کے میکدے میں
برائے مُصطفٰے زیدی نہیں ہے

خود رحمی :

کچُھ عشق کی اُفتاد تھی، کچھ حُسن کی توصیف
پہلے تو ہر اِک نظم میں اِک ڈھنگ تھا اِک طور
ہر شاعرِ امروز پہ لازم ہوئی جب فکر
ہم نے بھی کئی ایسے مسائل پہ کیا غور
اِس طرزِ تفکّر سے ہُوا ذہن میں آغاز
شکووں کا اک انبار، شکایات کا اِک دَور
اِس قسم کے شکوے کہ جو جائیں تو کہاں جائیں
انسان تو انسان ہے لندن ہو کہ لاہور
اِس قسم کے شکوے کہ جواں تھا ابھی زیدی
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اَور

اِس قسم کے شکوے کہ
یُونان کی زمین نے ہذیان و کرب میں
اک اندھے دیوتا کو جنم کس لیے دیا؟
جو بادِ تُند و دستِ صبا دیکھتا نہیں
انسان دیکھتا ہے خُدا دیکھتا نہیں

مری زبان پہ تانبے کا ذائقہ کیوں ہے
مرا ستارہ کدھر جگمگا کے ڈُوب گیا؟
نہ جانے سوزِ طبیعت نہیں کہ آہ نہیں
رِدائے ابر کے پیچھے نگارِ ماہ نہیں
نہ جانے کیسی ہے اب ارضِ خاک کی صحت
دُعا کریں نہ کریں، اِلتجا کریں نہ کریں

اب تک ہمارے ساتھ رفیقانِ جُستجو
کچھ موت، کچھ حیات کے ہمراہ آئے تھے

ہم ایسے بدنصیب کہ میخانہ دیکھنے
یاروں کے التفات کے ہمراہ آئے تھے
یوں ہم کہاں، شراب کہاں لیکن ایک شام
کچھ یار دوست ساتھ تھے کچھ ہم اُداس تھے
اُس کی نظر کے فیض سے غم اور بڑھ گیا
پہلے بھی تھے اُداس، مگر کم اُداس تھے

اِس اُداس کمرے میں
رات کیسے گزرے گی
نیند کیسے آئے گی
اے حبیب اے ہمدم
آج میری پلکوں پر
تیری اُنگلیوں کا لوچ
سسکیاں سی بھرتا ہے

سو چکی ہے کلیوں پر
تیرے ہونٹ کی شبنم
اے جلیس اے ہمدم
تیرا غم نہ اپنا غم
اِس اُداس کمرے میں
رات کیسے گزرے گی
نیند کیسے آئے گی

اندھیرے کی سُنسان لہروں کے پیچھے
ذرا سا جزیرہ
ذرا سے جزیرے میں دو چار سائے
دُھندلکے کی صُورت
اندھیرے کی مُورت
جو حسرت کو سمجھے نہ خوابوں میں جائے
دُھوئیں اور مٹی میں مکڑی کے جالے

یہ رُوحیں ، یہ گھر ، یہ محل ، یہ شوالے
کوئی اپنے کاندھوں پہ کیا کچھ سنبھالے

وُہ آگہی کہ زُلف نہ زنجیر دیکھیے
وُہ معرفت کہ کون و مکاں گردِ رہگزار
وُہ منزلِ گداز کہ حرفِ سکوت بار
وُہ روشنی کہ دوست کی تصویر دیکھیے

دسہرہ

عزیز دوست یہ سچ ہے کہ اِن نظاروں سے
ہمارے جسم کو آسُودگی نہیں مِلتی
سکُونِ دل کو ضروری ہے لمس کی لذّت
ہوا کی گود میں وارفتگی نہیں مِلتی

مگر یہ وقت نہیں فلسفے کی باتوں کا
فضا میں گُونج رہی ہیں طرب کی آوازیں
سڑک پہ شور ہے بچّوں کے لالہ زاروں کا
عجب نہیں کہ ہماری قنوطیت بھی مِٹے
ہمارے سر کو ہماری جبیں کو در تو مِلے
سکونِ دل نہ سہی، حاصلِ نظر تو مِلے

جدید عشق میں فرہاد کا مقام نہیں
جدید حُسن کو مجنوں کا احترام نہیں
غلط نہیں کہ ہمیں شخصیت کا پاس بھی ہے
ہمیں ضرورتِ تبدیلیٔ لباس بھی ہے
تری نگاہ میں احساسِ کمتری کیوں ہے؟
یہ تھرتھری یہ جھجک یہ فسردگی کیوں ہے؟
یہ عام راہ جہاں آج اتنی رونق ہے
طوائفوں کے گھروں کی طرف نکلتی ہے
اسی گروہ میں اخلاق کے کئی نقّاد
غرورِ فتح سے گردن اُٹھا کے چلتے ہیں
بڑے شکوہ سے سینے پُھلا کے چلتے ہیں
اُٹھا کے پھینک دے مشرق کی وضعداری کو
کہ تیرے ساتھ یہ افرادِ باحشم بھی ہیں
ہزاروں گھورنے والوں میں ایک ہم بھی ہیں
کسے مجال کہ ہم سے کوئی سوال کرے
زیادہ لوگ تو چلمن کی آڑ لے لے کر

سیاہ اور ہری ساریوں کو دیکھتے ہیں
کسی نگار کی تیّاریوں کو دیکھتے ہیں
تھکن سے چُور، گریباں دریدہ، چہرہ ماند
یہ پائجاموں کی بدبُو، یہ دھوتیوں کی لسیاندھ
یہ زندگی کا تلاطُم، یہ ہمہموں کا سماں
یہ جنسیات کے شُعلے، یہ بیڑیوں کا دُھواں
یہ سطحِ روشن و رنگیں، یہ اندرونی سوگ
یہ اپنے شہر کے بابُو، یہ اپنے گاؤں کے لوگ
اسی گروہ میں نا اہل و باکمال بھی ہیں
یہاں ضعیف بھی ہیں اور خوردسال بھی ہیں

کِسے مجال کہ ہم سے کوئی سوال کرے
کہ اس سوال سے بڑھ کر کئی سوال بھی ہیں
وُہی سوال جنھیں بے بسوں نے دُہرایا
جنھیں بگڑتی ہُوئی صحتوں نے دُہرایا

وُہی سوال کہ ہے جن میں انہدام کی بات
اس آتشک سے جُھلستے ہُوئے نظام کی بات
مشیّتوں سے اُلجھتی ہُوئی حقیقت میں
ضرورتوں کے تقاضائے صُبح و شام کی بات

کِسے مجال، کہ یہ مُلک اتنا بُزدِل ہے
کہ اپنا غم بھی بتانے میں عار ہے جِس کو
یہ مُلک جس میں عوامی حقُوق عام نہیں
یہ مُلک جس میں فقط ڈِگریاں ہیں کام نہیں
یہ مُلک جِنس کی تعلیم جُرم ہے جِس میں
یہ مُلک جِس میں ابھی تک نزاعِ مذہب سے
سِلے ہُوئے ہیں تفکّر، بِکے ہُوئے ہیں دماغ
یہاں تو جلنے سے ڈرتے ہیں بدنصیب چراغ
یہاں تو آج بھی ہے ذہنیت میں کل کا وقار
یہ "ہتھنیوں کا جزیرہ" یہ "ہاتھیوں کا دیار"

نظر اُٹھا مرے ہمدم، ورندگی کی نظر
یہاں تو ہم سبھی راون ہیں، اور کوٹھوں پر
سجی کھڑی ہیں ہماری صدی کی سیتائیں
وُہ وقت اور تھا جب رام ہم سے جیت گیا
وہ بات ختم ہوئی، وُہ زمانہ بیت گیا

نظر اُٹھا مرے ہمدم وُہ "چوکیاں" آئیں
عجب نہیں کہ ہمارے بھی بھاگ کُھل جائیں
عجب نہیں کہ ہمیں بھی کِسی کے چرنوں میں
نصِیب ہو سکے "بھگوان" کا کبھی درشن
اگر نہیں تو یہ آوارگی ہی کیا کم ہے
ہمارے سر کو، ہماری جبیں کو در تو مِلے
سکونِ دل نہ مِلے، حاصلِ نظر تو مِلے

پاگل خانہ

ہر طرف چاکِ گریباں کے تماشائی ہیں
ہر طرف غولِ بیاباں کی بھیانک شکلیں
ہم پہ ہنسنے کی تمنّا میں نکل آئی ہیں

چند لمحوں کی پُر اسرار رہائش کے لیے
عقل والے لبِ مسرور کی دولت لے کر
دُور سے آئے ہیں اشکوں کی نمائش کے لیے

عقل کو زہر ہے وُہ بات جو معمول نہیں
عقل والوں کے گھرانوں میں ہمیشہ کے لیے
تخت اور تاج تو کیا، بنچ اور اسٹول نہیں

اپنی ٹولی تو ہے کچھ سوختہ سامانوں کی
اکثریّت میں ہم آتے تو سمجھتی دُنیا
اِس کٹہرے کے اُدھر بھیڑ ہے دِیوانوں کی

دانہ و دام

ترے عظیم شہر کی عمارتوں کے سائے میں

نہ جانے کیوں خیال آ رہا تھا اُس نظام کا

کہ جس کے ماتحت سُنا ہے ساری کائنات ہے

بلند و پست، خیر و شر سبھی ہیں جس سے پست تر

جو لُطفِ بے پناہ ہے جو قہرِ بے کنار ہے

مَیں سوچتا تھا دل میں عرش و فرش کو سمیٹ کر

کِدھر سے آئے ہیں یہ قافلے کدھر کو جائیں گے

یہ حسرتیں جو سوچیے تو خار، سوچیے تو گُل

پھبک سکیں تو کس کے حق میں زہر، کس کو انگبیں؟

خیال تو بھٹک چلا تھا اور بھی کہ یک بہ یک

زمیں پہ ایک سانپ زخم کھا کے چُور ہو گیا

فضا میں ایک چیل دائرے بنا کے رہ گئی

احسان فراموش

جب منڈیروں پہ چاند کے ہمراہ
بجھتی جاتی تھیں آخری شمعیں
کیا ترے واسطے نہیں ترسا   اُس کا مجبور مضمحل چہرا؟
کیا ترے واسطے نہیں جاگیں؟
اُس کی بیمار رحمدل آنکھیں

کیا تجھے یہ خیال ہے کہ اُسے
اپنے لُٹنے کا کوئی رنج نہیں
اُس نے دیکھی ہے دن کی خونخواری   اُس پہ گُزری ہے شب کی عیّاری
پھر بھی تیری طرح وُہ بے چاری
ساری دُنیا سے شکوہ سنج نہیں

زندہ باد اے انائے جذبۂ عشق

مرحبا اے شکوہِ خودداری

اُس کی قربت سے تجھ کو پھول ملے زندگی کے نئے اصول ملے

تیری اُلفت سے کیا ملا اُس کو

زحمتیں ، اضطراب ، بدنامی

دُور کی آواز

میرے محبوب دیس کی گلیو !
تم کو اور اپنے دوستوں کو سلام
اپنے زخمی شباب کو تسلیم،
اپنے بچپن کے قہقہوں کو سلام

عُمر بھر کے لیے تمہارے پاس
رہ گئی ہے شگفتگی میری
آخری رات کے اُداس دِیَو
یاد ہے تم کو بے بسی میری

یاد ہے تم کو جب بُھلائے تھے
عُمر بھر کے کِیے ہُوئے وعدے
رسم و مذہب کی اِک پُجارن نے
ایک چاندی کے دیوتا کے لِیے

جانے اس کارگاہِ ہستی میں
اس کو وہ دیوتا مِلا کہ نہیں
میری کلیوں کا خُون پی کر بھی
اس کا اپنا کنّول کھِلا کہ نہیں

آج کل اُس کے اپنے دامن میں
پیار کے گیت ہیں کہ پیسے ہیں
تم کو معلوم ہو تو بتلانا
اُس کے آنچل کے رنگ کیسے ہیں

مجھ کو آواز دو کہ صُبح کی اوس
کیا مجھے اب بھی یاد کرتی ہے
میرے گھر کی اُداس چوکھٹ پر
کیا کبھی چاندنی اُترتی ہے؟

برف باری

کون سُنتا اس بھیانک رات میں دل کی پُکار
میرے ہونٹوں پر مری فریاد جم کر رہ گئی
زندگی اک بے وفا لڑکی کے وعدوں کی طرح
آنسوؤں کے ساتھ آئی آنسوؤں میں بہ گئی

تم کو کیا الزام دُوں پہلے ہی اپنے ذہن میں
کون سی شائستگی تھی، کون سی تنظیم تھی
صُبح یوں سُورج کی کرنیں پھیلتی تھیں ٹوٹ کر
جیسے اک ہاری ہُوئی صف پر جواری کی ہنسی
مجھ کو خود احساس تھا اس کا کہ شاید یہ خلش
اک نہ اک دن مُستقل آوارگی بن جائے گی

دل تو پہلے ہی لہو تھا تم کو کیا الزام دوں
اور بھی اک زخم کا مُنہ کھُل گیا تو کیا ہُوا
ایک بے معنی تمنّا کی جبیں سے سُرخ رنگ
تیز بوچھاروں کی زد میں دُھل گیا تو کیا ہُوا
ایک بے مقصد تسلسُل کو سمجھ لینے کا زہر
روز و شب کی دھڑکنوں میں گھُل گیا تو کیا ہُوا

تم نے شاید یہ نہیں سوچا کہ میری رُوح میں
اک اجنتا گر گیا، پتھّر کے ٹکڑے رہ گئے
کتنی نظموں کے لبوں پر پپڑیاں سی جم گئیں
کتنے افسانے خس و خاشاک بن کر رہ گئے
کتنے گیتوں کا تصوُّر جم گیا مضراب میں
کتنے بُت آدرش کے اندھے کھنڈر میں رہ گئے

کل تو اُس آوارگی میں بھی تھی منزل کی تلاش
اور اب تو مضطرب قدموں کو صحرا بھی کہاں

جو ترے بالوں کو سلجھا کر بھی ٹھنڈی رہ گئیں
اُن ٹھٹھرتی اُنگلیوں میں کیفِ صہبا بھی کہاں
جن سے کل شیشے میں پگھلی جا رہی تھی کائنات
آج اُن ہونٹوں کو حدّت کی تمنّا بھی کہاں

فاصلہ

۱

رات آئی تو چراغوں نے لویں اُکسا دیں
نیند ٹوٹی تو ستاروں نے لہو نذر کیا
کسی گوشے سے دبے پاؤں چلی بادِ شمال
کیا عجب اُس کے تبسّم کی ملاحت مِل جائے
خواب لہرائے کہ افسانے سے افسانہ بنے
ایک کونپل ہی چٹک جائے تو پھر جام چلے
دیر سے صُبحِ بہاراں ہے نہ شامِ فردوس
وقت کو فکر، کہ وُہ آئے تو کچھ کام چلے

۲

دُھوپ اُتری تو وُہی شامِ غریباں جس میں
اپنے سینے پہ مزاروں کا گماں ہوتا ہے
غم بھی ملتے ہیں تو جیسے کوئی دولت مل جائے
لُو بھی چلتی ہے تو احسان سے سر جھکتا ہے
آخری آس بھی ٹوٹے تو بڑا لطف و کرم
ریت کے پیار سے طوفاں کے جھکولے اچھّے
آگ لگ جائے جو گھر کو تو چلو جشن ہُوا
اپنے معمُول کی اس راکھ سے شُعلے اچھّے

کراہتے ہوئے دِل

مَیں اسپتال کے بستر پہ تم سے اتنی دُور
یہ سوچتا ہُوں کہ ایسی عجیب دُنیا میں
نہ جانے آج کے دن کیا نہیں ہُوا ہوگا
کِسی نے بڑھ کے ستارے قفس کیے ہوں گے
کِسی کے ہاتھ میں مہتاب آگیا ہوگا
جلائی ہوں گی کِسی کے نفَس نے قندیلیں
کِسی کی بزم میں خورشید ناچتا ہوگا
کِسی کو ذہن کا چھوٹا سا تازیانہ بہت
کِسی کو دل کی کشاکش کا حوصلہ ہوگا
نہ جانے کِتنے ارادے اُبھر رہے ہوں گے
نہ جانے کِتنے خیالوں کا دل بڑھا ہوگا

تمہاری پھُول سی فطرت کی سطح نرم سے دُور
پہاڑ ہوں گے، سمندر کا راستہ ہوگا

یہ ایک فرض کا ماحول، فرض کا سنگیت
یہ اسپتال کے آنسو، یہ اسپتال کی ریت
مرے قریب بہت سے مریض اور بھی ہیں
پکارتی ہُوئی آنکھیں، کراہتے ہُوئے دِل
بہت عزیز ہے ان سب کو زندگی اپنی
یہ اپنی زیست کا احساس کیسی نعمت ہے —

مگر مجھے یہی الجھن کہ زندگی کی یہ بھیک
جو مل گئی بھی تو کتنی ذرا سی بات ملی
کسی کے ہات میں مہتاب آگیا بھی تو کیا
کسی کے قدموں میں سُورج کا سر جھکا بھی تو کیا
ہُوا ہی کیا جو یہ چھوٹی سی کائنات ملی؟

مرے وجود کی گہری، خموش ویرانی
تمھیں یہاں کے اندھیرے کا علم کیا ہوگا
تمھیں تو صرف مقدّر سے چاند رات ملی

سراب

ہر صدا ڈوب چکی، قافلے والوں کے قدم
ریگ زاروں میں بگولوں کی طرح سوتے ہیں
دُور تک پھیلی ہوئی شام کا سنّاٹا ہے
اور مَیں ایک تھکے ہارے مسافر کی طرح
سوچتا ہوں کہ مآلِ سفرِ دل کیا ہے
کیوں خزف راہ میں خورشید سے لڑ جاتے ہیں
تتلیاں اُڑتی ہیں اور اُن کو پکڑنے والے
یہی دیکھا ہے کہ اپنوں سے بچھڑ جاتے ہیں

یاد

رات اوڑھے ہوئے آئی ہے فقیروں کا لباس
چاند کشکولِ گدائی کی طرح نادم ہے
ایک اک سانس کسی نام کے ساتھ آتی ہے
ایک اک لمحہ آزاد نفس مجرم ہے

کون یہ وقت کے گھونگھٹ سے بلاتا ہے مجھے
کس کے مخمور اشارے ہیں گھٹاؤں کے قریب
کون آیا ہے چڑھانے کو تمنّاؤں کے پھول
ان سلگتے ہوئے لمحوں کی چتاؤں کے قریب

وہ تو طوفان تھی سیلاب نے پالا تھے اُسے
اُس کی مدہوش اُمنگوں کا فسوں کیا کہیے
تھرتھراتے ہوئے سیماب کی تفسیر بھی کیا
رقص کرتے ہوئے شعلے کا جنوں کیا کہیے

رقص اب ختم ہُوا موت کی وادی میں مگر
کِسی پائل کی صدا رُوح میں پایندہ ہے
چُھپ گیا اپنے نہاں خانے میں سُورج لیکن
دل میں سُورج کی اک آوارہ کِرن زندہ ہے

کون جانے کہ یہ آوارہ کرن بھی چُھپ جائے
کون جانے کہ اِدھر دُھند کا بادل نہ چھٹے
کِس کو معلوم کہ پائل کی صدا بھی کھو جائے
کِس کو معلوم کہ یہ رات بھی کاٹے نہ کٹے

زندگی نیند میں ڈوبے ہُوئے مندر کی طرح
عہدِ رفتہ کے ہر اک بُت کو لیے سوتی ہے
گھنٹیاں اب بھی مگر بجتی ہیں سینے کے قریب
اب بھی پچھلے کو، کئی بار سحر ہوتی ہے

آسودگی

اِس کارزارِ وقت میں ، اِس کائنات میں
تسکین کی تلاش ہے دیوانگی کی بات

بےچارگیٔ ذہن ہے ہم معنیٔ جمود
آوارگی ہے حاصلِ رنگینیٔ حیات

اُس ولولے میں بھی تھا کبھی ارتقا کا راز
جو بخشتا ہے ذہنِ بشر کو توہّمات

فِطرت کی آبرو ہیں گرجتے ہوئے پہاڑ
دھرتی کا رنگ و نور ہیں بے رحم حادثات

دل کا فریب ہے ابدیّت کا فلسفہ
اِک جذبۂ حقیر ہے یہ جذبۂ ثبات

مَیں خوش نصیب ہُوں کہ تباہی کے باوجُود
دل میں مرے اُمنگ تو ہے گرمیاں تو ہیں
اُس پیکرِ حسیں کی محبّت نہیں تو کیا
اُس پیکرِ خلُوص کی ہمدردیاں تو ہیں

رات سُنسان ہے

میز چُپ چاپ، گھڑی بند، کتابیں خاموش
اپنے کمرے کی اُداسی پہ ترس آتا ہے
میرا کمرہ جو مرے دل کی ہر اک دھڑکن کو
سالہا سال سے چُپ چاپ گِنے جاتا ہے
جہدِ ہستی کی کڑی دُھوپ میں تھک جانے پر
جس کی آغوش نے بخشا ہے مجھے ماں کا خلوص
جس کی خاموش عنایت کی سُہانی یادیں
لوریاں بن کے مرے دل میں سما جاتی ہیں
میری تنہائی کے احساس کو زائل کرنے
جس کی دیواریں مرے پاس چلی آتی ہیں

سامنے طاق پہ رکھی ہُوئی دو تصویریں
اکثر اوقات مجھے پیار سے یوں تکتی ہیں
جیسے میں دُور کسی دیس کا شہزادہ ہُوں

۲

میرا کمرہ، مرے ماضی کا حقیقی مونس
آج ہر فکر، ہر احساس سے بیگانہ ہے
اپنے ہمراز کواڑوں کے احاطے کے عوض
آج میں جیسے مزاروں پہ چلا آیا ہوں
گرد آلودہ کلنڈر پہ اجنتا کے نقوش
میرے چہرے کی لکیروں کی طرف دیکھتے ہیں
جیسے اک لاش کی پھیلی ہوئی بے بس آنکھیں
اپنے مجبور عزیزوں کو تکا کرتی ہیں

یہ کتابیں بھی مرا ساتھ نہیں دیتیں آج
کیٹس کی نظم، ارسطو کے حکیمانہ قول
سنگِ مرمر کی عمارت کی طرح ساکت ہیں
تو ہی کچھ بات کر اے میرے دھڑکتے ہوئے دل
تو ہی اک میرا سہارا ہے مرا مونس ہے
تو ہی اس سرد اندھیرے میں چراغاں کر دے

لکشمی دیوی مری بات نہیں سن سکتیں
مجھ کو معلوم ہے کیا بیت چکی ہے تجھ پر
میرے چہرے کے سلگتے ہوئے زخموں کو بھی دیکھ
میری آنکھوں پہ مری فکر پہ پابندی ہے
مَیں اُسے چاہوں بھی تو یاد نہیں کر سکتا
تو اُسے کھو کے مچل سکتا ہے، رو سکتا ہے
اور مَیں لُٹ کے بھی فریاد نہیں کر سکتا

۳

اِسی آئینے نے دیکھے ہیں ہمارے جھگڑے
یہی زینہ ہے جہاں مَیں نے اُسے چُوما تھا
اِن قمیضوں میں اِن اُلجھے ہوئے رُومالوں میں
اُس کے بالوں کی مہک آج بھی آسُودہ ہے
جو کبھی میری تھی انکار پہ بھی میری تھی
اب فقط بزمِ تصوّر میں نظر آتی ہے
رات بھر جاگ کے لکھّی ہُوئی تحریروں سے
اب بھی اُن آنکھوں کی تصویر اُبھر آتی ہے

۴

چاندنی کھل کے نکھر آئی ہے دروازے پر
اوس سے بھیگتے جاتے ہیں پرانے گملے
کس قدر نرم ہے کلیوں کا سُہانا سایہ
جیسے وہ ہونٹ جنھیں پا کے بھی مَیں پا نہ سکا
اے تڑپتے ہُوئے دل اور سنبھل اور سنبھل
یہ تری چاپ سے جاگ اٹھّیں گی تو کیا ہوگا

صُبح کیا جانے کہاں ہوتی ہے، کب ہوتی ہے
جانے اِنسان نے کِس وقت یہ نعمت پائی
میری قِسمت میں بس اک سلسلۂ شام وسحر
میرے کمرے کے مقدّر میں فقط تنہائی

عدالت

خدائے قدوس کی بزرگ اور عظیم پلکیں
زمیں کے چہرے پہ جھک گئی ہیں
زمین کی دخترِ سعید اپنے آنسوؤں اور ہچکیوں میں
شفیق، ہمدرد باپ کی بارگاہ کا اک ستون تھامے
گنہ کا اقرار کر رہی ہے۔

ترے فرشتے ——————

ترے فرشتے کہ جن کی قسمت میں محض تسبیح و نَے نوازی
نہ سوزِ فطرت نہ دل گدازی
یہ وُہ ہیں جن کے شریر اور بدمزاج بچوں
نے آسماں کے کئی ستاروں کو توڑ کر
اپنے ہات میں خون کر دیا ہے

یہ وُہ ہیں جن کی غلام رُوحوں
نے صُبح کے دیوتا کا مندر
سفید برفانی چوٹیوں کی بلندیوں سے ہٹا دیا ہے
اگر یہی ہے گُنہ کہ جب
دیوتا کے تلووں پہ دربدر ٹھوکروں کی کثرت
سے آبلے پھُوٹنے لگے تھے
تو ایک معصوم بھولی بھالی حسین لڑکی نے اپنے گھر میں
اُسے بُلایا تھا، اُس کے زخموں کو دھو کے مرہم لگا دیا تھا
اُسے محبّت کی نرم، پاکیزہ لوریوں میں سُلا دیا تھا

تو پھر خُدایا
تری کُنواری، سعید لڑکی
گناہ کا اعتراف کر کے
سزا کی حقدار ہو گئی ہے

ترا شیدم ....

ایک قندیل جلائی تھی مری قسمت نے
جگمگاتے ہُوئے سُورج سے درخشاں قندیل
پہلے یوں اُس نے مرے دل میں قدم رکھا تھا
ریت میں جیسے کہیں دُور چمکتی ہُوئی جھیل
پھر یہی جھیل اُمڈ آئی سمندر بن کر
ایک پیمانے میں ہونے لگی دُنیا تحلیل

اک فقط میں ہی نہ تھا کُشتۂ احساسِ شکست
اور بھی لوگ تھے واماندہ و مجرُوح و قتیل

اُس نے ماحول کو قدموں کے تلے روند دیا
اور ماحول نے اُس کے لیے ایوان سجائے
اُس کی ٹھوکر میں تھا قانون کا سازِ کُہنہ
ساز نے اُس کی حمایت کے لیے راگ بنائے

اُس کے ماتھے کی ہر اک لہر تھی طُوفان بدوش
ہر سفینے نے بڑے عجز سے مستول جُھکائے
آگ میں کُود پڑا اُس کا جیالا اِدراک
آگ نے اُس کی زیارت کے لیے پھُول بچھائے

اُس کی باتوں کا ھر انداز حریفانہ تھا
جس سے بچنے کی نہ قُوّت تھی نہ لڑنے کی سبیل
یہ فقط میرا کلیجہ تھا کہ مَیں نے بڑھ کر
سب سے پہلے اُسے بخشی غمِ دل کی تادیل
اُس کی آنکھوں کو ستاروں کے حسیں خواب دِیے
اُس کے چہرے کو عطا کی سحرِ دِجلہ و نیل
آگ خود بن گئی گلزار تو کیا ہوتا ہے
کَون پتّھر کو بدل سکتا ہے ــــ آذر کہ خلیل؟

پرستیدم شکستم ....

پہلے میرے گیتوں میں
سُرمئی نقابیں تھیں
چمپئی تبسّم تھے!
پہلے میرے نغموں پر
جھومتی ہوئی کلیاں
آنکھ کھول دیتی تھیں
انقلاب کی لَے پر
میری نظم بڑھتی تھی
جیسے ریل کے پہیے
پٹڑیوں کے لوہے پر
فن کے گیت گاتے ہوں

میری نظم کے پیچھے
زندگی کی دھڑکن تھی
ماسکو کے گُنبد تھے
چین کی چٹانیں تھیں
پیبلو نرودا کا
بے پناہ نغمہ تھا
بجلیوں کی عظمت تھی
آندھیوں کی قُوّت تھی

آج میرے ہونٹوں سے
راگ یوں اُبھرتے ہیں

جیسے ناؤ میں مانجھی
ڈوبتی ہوئی لے میں
ماہیا سناتے ہیں
میری نظم گھائل ہے
میرے گیت روتے ہیں
اپنا حال دیکھ کر
ہارڈی کے ناول کے
لوگ یاد آتے ہیں

پہلے دل کے ساگر پہ
جاگتی ہوئی لہریں
جھومتی ہوئی کرنیں
ڈول ڈول جاتی تھیں

زندگی کے جھولے پر
ٹہنیوں کے سائے سے
نکہتیں اترتی تھیں
اب شدید گرمی میں
تاڑ کے درختوں پر
اک مہیب سناٹا
سائیں سائیں کرتا ہے

مدتوں کا پروردہ
ایک نقش تھا دل پہ
جس کو چند لمحوں نے
داستاں بنا ڈالا

رات بھر کوئی دل میں
کروٹیں بدلتا تھا
اِک چراغ بُجھتا تھا
اِک چراغ جلتا تھا
جُون کے مہینے کی
بے پناہ تنہائی
چیخ چیخ اُٹھتی تھی
بے کسی کے عالم میں
دوست یاد آتے تھے
ساتھ چلنے والوں کی
شکل یوں اُبھرتی تھی
جیسے جیل کے اندر
آہنی سلاخوں سے
اک اُداس قیدی پر
چاندنی اُترتی ہے

اور یہ سبھی چہرے
اک دُھوئیں کے بادل میں
ڈوب ڈوب جاتے تھے
صرف ایک چہرہ تھا
جو کبھی نہیں ڈُوبا
جو کبھی نہیں بِکھرا
اور جو تصوُّر میں
آنسوؤں کی چلمن سے
اِس طرح اُبھرتا تھا
جیسے گھر سے پہلی بار
اِک شریف کُنبے کی
نازنیں نِکلتی ہے

صُبح دُھوپ چڑھنے پر
آنکھ ایسے کُھلتی تھی
جیسے نوکِ ناخُن سے
کوئی زخم چِھل جائے
دُودھ کے پیالے میں
جیسے ریت مِل جائے
بے بسی میں بڑھتے تھے
یُوں اُمید کے سائے
جیسے کوئی میلے میں
راستہ بھٹک جائے
گرم گرم آنکھوں میں
پھانس سی کھٹکتی تھی
اپریل کے کھمبوں پر
رات سر پٹکتی تھی

اور پھر وہ دِن آیا
جب یہ جاگتی آنکھیں
اُس کو دیکھ سکتی تھیں
اُس کو دیکھ لینے پر
دل کی ایسی حالت تھی
جَیسے کوئی پردیسی
دُور کے سفر کے بعد
ایک سرد چشمے پر
ہات پیر دھوتا ہَے

لیکن اے غمِ آخر
صرف ایک لمحے کو
زندگی نہیں کہتے
اے تلاشِ لاحاصل
مُسکرا کے ملنے کو
دوستی نہیں کہتے

اے مِرے تصوّر کی
بے حجاب شہزادی
مجھ کو تیرے کانوں میں
ایک بات کہنی تھی
بات جس کے کہنے کو
میرے ہونٹ جلتے تھے
بات جس کے کہنے کو
میرا دِل سُلگتا تھا

اب فقط یہ کہنا ہے
جو چراغ سینے کی
آندھیوں میں جلتے تھے
وُہ ذرا سی کوشش سے
جھلملا بھی سکتے ہیں
حوصلے کے آدمی
اپنے دِل کے زخموں پر
مُسکرا بھی سکتے ہیں
بُت بنانے والے ہات
فیصلے کے لمحوں میں
بُت گرا بھی سکتے ہیں

پہلی محبّت کے نام

وقت سے کس کا کلیجہ ہے کہ ٹکرا جائے
وقت انسان کے ہر غم کی دوا ہوتا ہے
زندگی نام ہے احساس کی تبدیلی کا
صرف مر مر کے جیے جانے سے کیا ہوتا ہے

تو غمِ دل کی روایات میں پابند نہ ہو
غمِ دل شعر و حکایت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ تری کم نظری ہے کہ تری آنکھوں میں
ایک مجبور شکایت کے سوا کچھ بھی نہیں

ارتقا کی نئی منزل پہ مصوّر کی نِگاہ
اپنی تصویر کے انداز بدل جاتی ہے
زاویے پاؤں کے ہر رقص میں ہوتے ہیں جُدا
ہر نئے ساز پہ آواز بدل جاتی ہے

یہ مرا جُرم نہیں ہے کہ جَرَس کے ہمراہ
مَیں نئی راہگزاروں پہ نِکل آیا ہُوں
میرے معیار نے اک اور صنم ڈھال لیا
مَیں ذرا دُور کے دھاروں پہ نِکل آیا ہُوں

پھر بھی تقدیر کو اِس کھیل میں کیا لُطف مِلا
(تیرے نزدیک جو ہم معنئ الزام بھی ہے)
آج جس سے مرے آنگن میں دِیے جلتے ہیں
تیری ہم شکل بھی ہے اور تری ہم نام بھی ہے

شریکِ حیات

تری مقدّس جبیں پہ مَیں نے
سحر کی پہلی کرن کو دیکھا
ترے لبوں کی حلاوتوں میں
سپُردگی کی لگن کو دیکھا
لطیف، مانوس سادگی میں
رچے ہُوئے بانکپن کو دیکھا

تجھے تو وُہ دن بھی یاد ہوں گے
جب "آپ" کہتے ہُوئے بھی تجھ کو
میں ڈر رہا تھا کہ جانے کیا ہو

تجھے تو وُہ دن بھی یاد ہوں گے
جب اک تجھے جیتنے کی خاطر
مرے خرد نے مرے جنوں نے
ہزاروں بدنامیاں خریدیں
ہزار دیر و حرم سے گُزرا
"گداگروں" کے "کرم" سے گُزرا
خدائے برتر کی سرزمیں نے
"سماج" بن کر قدم قدم پر
مرے لیے سَو قفس سجائے
ببُول کے راستے بنائے
اب اُن کے مَیں نام کیا گناؤں
جو خیر سے تھے "سماج دشمن"
مگر جو سب سے نظر بچا کر
سماج کے پاؤں چاٹتے تھے

نئے اُجالے کے گیت گا کر
سحر کی شہ رگ کو کاٹتے تھے

اور اس سے بڑھ کر ستم ظریفی
ہمارے عہدِ جدید میں بھی
غزل کے محبوب کی روایت
اٹل حقیقت کے روپ میں تھی
تجھے بھی مَیں نے اِسی میں دیکھا
تجھے بھی مَیں نے اِسی میں پایا

مگر زمانہ بدل رہا تھا
دماغ تبدیل ہو رہے تھے
نگاہ کو نُور مل رہا تھا
شعُور پر دھار آ رہی تھی

بہ فیضِ تقدیسِ جذبِ محکم
گزر گئے دن مُصیبتوں کے

اب اِس پُر اسرار چاندنی میں
سیاہ کرنیں چھُپی نہیں ہیں
ہم اجنبی، اجنبی نہیں ہیں
یہ نرم مصرعے، یہ تیز فقرے
ترا قلم ہے جو لکھ رہا ہے
یہ جو ہے کی لطیف خوشبو
ترے دوپٹے سے آ رہی ہے

ترے تخیُّل کی انجمن میں
مرا تخیُّل چمک رہا ہے
ترے تصوُّر میں چاند بن کر
ہمارا بچہ ہمک رہا ہے

یہ ایک نام

شفق سے دُور، ستاروں کی شاہراہ سے دُور
اُداس ہونٹوں پہ جلتے سُلگتے سینے سے
تمھارا نام کبھی اِس طرح اُبھرتا ہے
فضا میں جیسے فرشتوں کے نرم پر کُھل جائیں
دِلوں سے جیسے پُرانی کدُورتیں دُھل جائیں

یہ بولتی ہُوئی شب، یہ مُہیب سنّاٹا
کہ جیسے تُند گناہوں کے سیکڑوں عفریت
بس ایک رات کو دُنیا کے حُکمراں ہو جائیں
اجل کے غار سے نِکلی ہُوئی گراں رُوحیں
لہُو سے پیاس بُجھا کر کہیں مزاروں میں
نشے کے بوجھ سے چیخیں، تو چیختی رہ جائیں

اسی جنوں میں، اسی آندھیوں کے میلے میں
تمہارا نام کہیں دُور جگمگاتا ہے
سفید، دُودھ سے شفّاف، عکس سے نازک
اُداس رُوح کی لہروں پہ نرم دیپ جلائے

تمہارے نام سے یادوں کے کاروانوں میں
چمکتی جاگتی چاندی کی گھنٹیوں کی کھنک
کچھ آنسوؤں کی گھلاوٹ، کچھ آرزو کی کسک

یہ ایک نام نہ ہوتا تو اِس اندھیرے میں
جہاں سحر کا پتہ ہے نہ زندگی کا سُراغ
نہ جانے کتنے عقیدے، نہ جانے کتنے خیال
نہ جانے کتنے ستارے، نہ جانے کتنے چراغ
تلاش کرتے مگر روشنی نہیں ملتی
ہزار رنگ بکھرتے، ہزار کچے رنگ
جو اب نصیب ہے وُہ سادگی نہیں ملتی

ڈھونڈ چکا میں موج موج، دیکھ چکا صدف صدف

(یورپ کے سفر کی جذباتی روئداد)

صنم خانے

سچ یہ ہے کہ وہ غم بھی رہا شاملِ امروز
جس غم میں نہ تخلیق، نہ تعمیر، نہ پرواز
جو گُنبدِ آفاق کی ہمراز رہی تھی
دیوار سے ٹکرا کے پلٹ آئی وہ آواز
اب سنگِ سبک مایۂ زنداں بھی نہیں ہیں
آئینۂ زُلف و لب و مژگاں تھے جو الفاظ
جس طبع کے دامن میں تھے اُٹھتے ہُوئے خورشید
وہ ڈوبتے مہتاب کی کرنوں سے بھی ناراض

اے نُزہتِ مہتاب!

امروز، کہ سڑکوں کے چراغاں میں کٹا تھا
امروز، کہ تھا رنگ و رُخ و نُور کا سیلاب
کچھ اور بھی تھا رنگ و رُخ و نُور سے آگے
جلتا ہُوا آہنگ، سُلگتا ہُوا مضراب

صدیوں کے تمدّن سے دمکتی ہوئی دیوار
قرنوں کے احادیث سے نکھری ہوئی محراب
اِک دل جو روایات کی ہر وضع کا مرکز
اک ذہن جو تحریکِ سماوات میں سیماب

کِس طرح یقیں آئے کہ اس ذہن نے اک روز
دانستہ روا رکھّے تھے تخریب کے آداب؟
کِس طرح یقیں آئے کہ مَیں اپنی خوشی میں
تحقیر سے دُہراؤں گا فریاد کے القاب؟
کِس طرح یقیں آئے کہ ہو گی تجھے منظُور
توصیفِ شبِ ہجر و نوائے دلِ بے تاب؟
اے نُزہتِ مہتاب!

(لندن)

اپسراؤں کا گیت

(ایک ریوو)

ریوو سطحی اور وقتی دلچسپی کے لیے پیش کیے جانے والے طربیے کو کہتے ہیں۔ اس طربیے کے پیچھے کبھی کبھی ایک حزن اور ایک آس بھی نظر آسکتی ہے جیسا کہ اس گیت میں ہے۔ یہ گیت لندن کے قدیم "ونڈمل تھیٹر" کے ایک ریوو کا تاثر ہے۔

۱

آج کی رات بھی کٹ گئی
جھومتی مسکراتی ہوئی
اب کی برسات بھی کٹ گئی

زخم دھونے کی فرصت ملے
کاش وہ فصل بھی آسکے
جس میں رونے کی فرصت ملے

۲

ہم نے جو کچھ کہا، ہو گیا
وقت قدموں سے لپٹا رہا
فاصلہ راہ میں سو گیا

رنگ و رم سے بھی اُلجھے کوئی
کوئی پتھر، کوئی خارِ غم
کاش ہم سے بھی اُلجھے کوئی

۳

ہم کہ خوابوں کی شہزادیاں
ہم کہ نغموں کی رُوحِ رواں
ہم کہ پندار کی دیویاں

کاش دُنیا خجل دیکھ لے
دیویوں کی قبا کے اُدھر
کوئی عورت کا دِل دیکھ لے

شہرِ آذر

پیل کاسل پر ایک شام

انگلستان کے جزیرے "آئل آف مین" کے مغربی ساحل پر شہر پیل ہے جس کو (Sunset City of the West) کہا جاتا ہے۔ پیل کاسل پر ورڈسورتھ کی بھی ایک نظم ہے جو اس نے بیومانٹ کی بنائی ہوئی تصویر دیکھ کر لکھی تھی اور جس کی طرف اس نظم میں اشارے ہیں۔ میں نے "شہرِ آذر" کے بیشتر حصے پیل کاسل کے سامنے پہاڑیوں پر لکھے ہیں۔

میں اس پہاڑ کی چوٹی پہ کب سے بیٹھا ہوں

پرومناڈ پہ سورج کی آخری کرنیں

اُداس لہروں کے مدّھم سُروں میں ڈوب گئیں

فضا نے آنکھوں میں کاجل سے نقش کی تحریر

شفق نے کانوں میں سونے کی بالیاں ڈالیں

سرود و سحر و طلسمات کے جزیرے میں

نگارِ ساحلِ مغرب کہاں سنور کے چلی

کسی کی یاد کا بارِ گراں اُٹھائے ہُوئے
عجیب فسوں ہے دُھندلکے میں ہپیل کا سل پر
نہ سوزِ شاہد تنہا نہ سازِ شاہدِ بزم
نہ بیومانٹ کا خاکہ، نہ ورڈسورتھ کی نظم
بس اِک خموش کہانی کی چوٹ کھائے ہُوئے
ہزاروں شاموں کی تنہا رفیق راہ گزار
لبوں میں راگ، نگاہوں میں آگ بھر کے چلی

میں ان اُداس دُھندلکوں میں کب سے بیٹھا ہُوں
(یہاں بھی اپنی پُراسرار عادتیں نہ گئیں)
پرومناڈ پہ لوگوں نے چند لمحوں کو
نیا دیار بنایا تھا ہر دیار سے دُور
خدا کی سلطنتِ جبر و اختیار سے دُور
وہ اک دیار جہاں بانوئے حریم حجاب
چلی تو یورشِ آداب سے گزر کے چلی

چلی تو یوں کہ نہ ماضی کا غم نہ شکوۂ حال
جھکیں ادب سے سمندر کی نیلگوں آنکھیں
قدم پہ پھیل گئے ریت کے سنہرے بال
مری وفا کی طرح ایک سو نہ چاکِ جگر
مرے وطن کی طرح مضمحل نہ سوختہ حال
بس اک تبسمِ فردا کی آرزوئے وصال
کسی سے پیار کسی سے نیاز کر کے چلی

یہ ڈوبتے ہوئے سورج کے رنگ روپ کا شہر
یہ لہر لہر پہ سورج کے آخری سائے
کہ زرد کپڑوں میں جس طرح راہبر کوئی
گلی سے گھر میں مڑتی ہوئی نظر آئے
کہیں اک اوس کا قطرہ دھوئیں پہ جم جائے
ہر ایک لہر کی تہدیدِ شوق سے بچ کر
ہر ایک لہر کی آغوش میں نکھر کے چلی

اُتر کے اونگھتے کہرے کی نرم باہوں سے
تمہارے قُرب کی دھڑکن فضا میں پھیل گئی
کہیں سے خواب کے لمحوں کو مُستعار ملی
تمہارے بالوں کی خوشبو، تمہارے جسم کا رنگ
تمہارے ہونٹوں کے مدّھم، ملائم انگارے
پہاڑ، اپنی بلندی کی بات بھول گئے
ہوا، زمین کے میزان پر اُتر کے چلی

اگر کچھ اور مہکتے رہے یہ آگ کے پھول
تو ہر خلیل کا پندار ٹوٹ جائے گا
سڈول لمحوں کی آغوش اور تنگ ہوئی
تو رسمِ دل سے ہر اقرار ٹوٹ جائے گا
طلسمِ سلسلۂ دار ٹوٹ جائے گا
کہ جب یہ رسم چلی ہم جگر فگاروں میں
تو حلقۂ رسن و دار سے گزر کے چلی

آئل آف مین

فرانس

یوں نرم نِگاہی سے ہُوا شام کا آغاز
جس طرح کبُوتر کے پرے سر سے گزر جائیں
جیسے ترے گیسو مری آنکھوں پہ بکھر جائیں

اِس شام سرا پردۂ اسرار سے تقدیر
مہکے ہُوئے سُورج میں نہاتی ہُوئی نکلی
نُور کے در و بام سجاتی ہُوئی نکلی

اُس دیس سے آیا ہے ابھی ایک مُسافر
جس دیس میں اک خوابِ گرانبار ہے منزل
اک حرفِ جنوں، وحشتِ بیمار ہے منزل

اک عُمر تو گُزری ہے سرِ خُنکیٔ محراب
اک شام گناہوں کی حرارت میں بھی گُزرے
اے میرے بدن تیری عبادت میں بھی گُزرے

ناچ اے لب و رُخسار کے جلتے ہوُئے حلقے
اس لمس کے تہذیب و تمدّن سے لپٹ کر
اس شاہدۂ زیست کے اقرار سے کٹ کر

گا اے اَبدی راگ سے مخمور جوانی
مَرمَر کی رگوں میں تپشِ جام اُچھل جائے
پتّھر کی قبا آنچ کے احساس سے جل جائے

جُھوم اے دلِ دانا کہ وہ کل آکے رہے گی
جب ہم دلِ ناداں کا عَلَم لے کے چلیں گے
سینے میں غضب، لب پہ قسم لے کے چلیں گے

زہرہ کے حسیں جسم، اپالو کے حسیں خواب
ہم رُوح کے ننگے تری تکذیب کریں گے
پَیدل ہیں تو رفتار پہ تادیب کریں گے

اے عقل محبّت کی سزا ہے کہ نہیں ہے
اے جسم ترا پیار روا ہے کہ نہیں ہے
اے پردۂ اسرار خُدا ہے کہ نہیں ہے

پیرس

جرمنی

مَیں نے کب جنگ کی وحشت کے قصیدے لکھے؟
مَیں نے کب امن کے آہنگ سے اِنکار کیا
مَیں نے تو اپنے سرِ دامنِ دل کو اب تک
کبھی پھولوں، کبھی تاروں کا گنہگار کیا
اے مری رُوحِ طَرب مَیں نے تو ہر عالم میں
جب بھی تو آئی، ترے پیار کا اِقرار کیا

لیکن اس دیس کے آہنگِ گرانبار میں بھی
وہی نغمہ ہے جو شب تاب کی تقدیر میں ہے
مَیں نے زُلفوں کے گھنے سائے میں سیکھی تھی جو بات
وُہی اس حلقۂ بدنام کی زنجیر میں ہے

کتنے خوابوں کے طلسمات کی جنّت ہے یہاں
کون سا خواب ابھی پردۂ تقدیر میں ہے

خواب اُس وقت کا جو وقت نہیں آسکتا
خواب اُس وقت کا جس وقت کو آنا ہوگا
گیت جس میں لب و رُخسار کے افسانے ہیں
گیت جو خود بھی کبھی ایک فسانہ ہوگا
جس کو چھیڑیں گے مہکتے ہُوئے ہونٹوں کے گلاب
جس کو بندُوق کے آہنگ پہ گانا ہوگا

آگ کے دشت پڑے، خُون کے صحرا آئے
اب بھی لیکن وُہی رفتارِ جواں ہے کہ جو تھی
میونخ اب بھی ہر اک عہد کا روشن وارث
ہائیڈلبرگ وہ حکمت کی دُکاں ہے کہ جو تھی

فرض کرتے ہیں تری مرگ وُہی لوگ جنھیں
خود نہ جینے کا سلیقہ ہے نہ مرنے کا شعُور

تیرے ماتھے پہ نئے عہد، نئے دن کی اُمنگ
تیری آنکھوں میں چمکتے ہُوئے مہتاب کا نُور
ویگنر کا یہ سبک ساز، یہ فولاد کے گیت
تیرے سینے کی اُمنگیں، ترے بازُو کا غرُور

ہم پیمبر تو نہیں ہیں ترے دیوانے ہیں
اک ذرا آگ ہمیں بھی سے مِلے اے شعلۂ طُور

(فرینکفرٹ)

ڈوور

مے خانے سے میلوں جگمگ جگمگ کرتی نہر
تیرے سینے کی طغیانی، میرے دل کی لہر
ریت کی دیواروں سے بنا تھا پیار کا پہلا شہر

نگر نگر کے خواب میں گم ہیں ڈوور کے ملّاح
میں ان خوابوں کے مبہم سنّاٹے سے آگاہ
اونچی لہریں، بڑھتا دریا، نیچی شہر پناہ

شاید اس طوفان میں ساری بنیادیں ہل جائیں
یا مشرق اور مغرب کے ساحل اک دن مل جائیں
یہ مبہم مبہم سپنے کمھلائیں یا کھل جائیں

(کیٹس)

یُونان

ہم تو یہ سوچ کے آئے تھے تری گلیوں میں
کہ یہاں تیشۂ فرہاد کی قیمت ہوگی
بھائی کیوپڈ سے ملیں گے کسی دوراہے پر
کسی بے نام سے اِک موڑ پہ جنّت ہوگی
ہم اولمپس پہ خُداؤں کی زباں بولیں گے
اپنی تقدیر میں وینس کی رفاقت ہوگی

باادب جا کے زِئیس سے یہ کہیں گے کہ حضُور
آپ اب خلوتِ گمنام سے باہر نکلیں
دیر سے تشنۂ صُبحِ لب و رُخسار ہیں لوگ
آپ تاریکیٔ احرام سے باھر نکلیں

پارتھینان کی مٹّی سے جو مس ہو گی نظر
ہم نے سوچا تھا کہ کھُل جائیں گے سارے اسرار
آج کل یُوں نہیں ہوتا ہے مگر شاید آج
ٹُوٹ جائیں گے تمدُّن کے مہذّب پندار

اور اب شام بھی گزری کئی دِن بیت گئے
ایسے دن جن میں نہ ارماں نہ گِلے ہوتے ہیں
میرا سینہ شبِ مُفلِس کا وُہ افسانہ ہے
جس پہ ایتھنز کے خاموش دِیے روتے ہیں
ایسی پستی کہ عمارت کا گماں بھی دھوکا
جانے٭ ہم کور نظر ہیں کہ خُدا سوتے ہیں

(اکراپولس)

٭ لکھنؤ میں "نہ جانے" یا "خدا جانے" کو درست سمجھا جاتا ہے۔ دِلّی اور الٰہ آباد میں "جانے" مُستعمل ہے۔

مِصرؔ ○

یہ زندگی، یہ مختصر سی زندگی
اگر یونہی علالتوں کے سِلسلے میں کٹ گئی
اگر یہ بانسری نہ اوس پی سکی، نہ چاندنی کے زمزمے گا سکی
اگر عروسِ شام کی ردائے نخیف انگلیوں میں ہاتھ تھرا کے رہ گئی
تو مَیں کہاں تک اپنے حوصلے کے بل پہ اپنی زخم خوردہ کائنات کو سجاؤں گا
دریدہ پیرہن میں زرد زرد پھول باندھ کر
میں سُرخ کونپلوں کی انجمن میں کیسے جاؤں گا

سحر سوئیز پر ہوئی
تو جلتی آنکھ، تپتے جسم، خشک لب کے باوجود
مَیں کیبنوں کی تنگیوں کو چھوڑ کر کھُلی ہوا میں آ گیا

○ انگلستان جاتے ہوئے جبرالٹر کے پورٹ پر شدید علالت میں لکھی گئی

سوئیز اپنے ساحلوں کے درمیان ایسے بہ رہی تھی جیسے کوئی اپنے حُسن کا وقار جانتے ہوئے قدم اُٹھائے
اور سے اک قطار میں جہاز ایسے بڑھ رہے تھے جیسے کوئی بھکشوؤں کا قافلہ گپھا میں جائے
فرنگیوں کے چہرے یوں اُجڑ گئے تھے جیسے کوئی اک قدم کے فاصلے پہ موت سے نظر ملائے

نگارِ ارضِ نیل کے سنہرے جسم کے گداز سے لپٹ کے ایک ایک آرزو چمک گئی
نگارِ ارضِ نیل کی لٹیں کھلیں تو دُور دُور تک ہوا مہک گئی

ہوا مہک گئی تو کیا
کہ میں ڈٹال اور اسپرٹ کا میہمان تھا
مرے تھکے ہُوئے قدم
سفر کے پہلے سنگِ میل سے لپٹ کے رہ گئے
مجھے کسی ملُول، دِل شکستہ یاد کی طرح
سُلگتے آنسوؤں کی لوریوں میں نیند آگئی
مگر حسین قاہرہ کی رات جاگتی رہی
مُہیب بُت کے عاشقوں کو موت آگئی تو کیا
مُہیب بُت کی عظمتِ حیات جاگتی رہی

(جبرالٹر)

کربلا، مَیں تو گنہگار ہُوں لیکن وُہ لوگ
جن کو حاصل ہے سعادت تری فرزندی کی
جسم سے، رُوح سے، احساس سے عاری کیوں ہیں
اِن کی مسمار جبیں، ان کے شکستہ تیور
گردشِ حُسنِ شب و روز پہ بھاری کیوں ہیں
تیری قبروں کے مجاور، ترے منبر کے خطیب
فِلس° و دینار و توجّہ کے بھکاری کیوں ہیں؟

روضۂ شاہِ شہیداں پہ اک انبوہِ عظیم
بل آیَر اور کرسلر کے نئے ماڈل کو

° عراقی سکہ

اُسی خاموش عقیدت سے تکا کرتا ہے
جس کو کہ دُوں تو کئی لوگ بُرا مانیں گے
غیر تو رمزِ غمِ کون و مکاں تک پہنچے
کربلا تیرے یہ غمخوار کہاں تک پہنچے

دل کو تہذیبِ تمنّا میں خدا ملتا ہے
جُنبشِ یک لبِ عیسیٰ میں خدا ملتا ہے
شورِ ناقُوس و نظارا میں خدا ملتا ہے
سنگِ محرابِ کلیسا میں خدا ملتا ہے
تیرے دیوانوں کو اے شاہدِ دریائے فرات
اپنی بے مانگی ذہن میں کیا ملتا ہے؟

(کربلا)

ویلز کی گاڑی

دِن بھر کے سُورج کی ہمّت ٹوٹ چکی تھی
ویلز کو جانے والی گاڑی چھُوٹ چکی تھی
یہ احساس تھا جیسے دِل آباد نہیں ہے
کون سا اِسٹیشن تھا، بالکل یاد نہیں ہے
یوں بے رنگ تھے جیسے دشت میں گزریں برسوں
ہم ہونے کو کیسا نو وا ہوں یا کچھ ہوں

تھوڑی دیر میں جب سہ پہر کی گاڑی آئی
ہم نے اپنا کوٹ سنبھالا۔ فلٹ اُٹھائی
لیکن ریل میں داخل ہوتے ہی لہرائے
جیسے جسم کو جھُولے سے بجلی چھُو جائے

وہ سنگیت تھی یا تارا تھی یا نسرین تھی
ایسی شکل تو سارے لندن میں بھی نہیں تھی
دو گھنٹوں میں دوست بنے ہم پیار جتایا
یہ قصہ تو خیر کسی فرصت پہ اُٹھایا
لیکن اتنا یاد ہے جب سُورج نے جگایا
وہ بھی نہیں تھی اپنا اسٹیشن بھی نہیں تھا
جانی پہچانی چیزیں تھیں۔ خاموشی تھی
ویلز کی گاڑی۔ ویلز سے واپس آ پہنچی تھی

اِنہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ

مرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے

○

لوگوں کی ملامت بھی ہے، خود دردِ سری بھی
کس کام کی یہ اپنی وسیع النظری بھی

کیا جانیے کیوں سُست تھی کل ذہن کی رفتار
ممکن ہُوئی تاروں سے مری ہم سفری بھی

راتوں کو کلی بن کے چٹکتا تھا ترا جسم
دھوکے میں چلی آئی نسیمِ سحری بھی

کس عشق کو اس معرکۂ دل میں ہُوئی جیت
اک چیز ہے لیکن یہ مری بے جگری بھی

خود اپنے شب و روز گزر جائیں گے لیکن
شامل ہے مرے غم میں تری دربدری بھی

فرقت کے شب و روز میں کیا کچھ نہیں ہوتا
قُدرت پہ ملامت بھی، دُعائے سحری بھی

اک فرد کی اُلفت تو بڑی کم نظری ہے
ہے کس میں مگر اہلیتِ کم نظری بھی

○

بزرگو ، ناصحو ، فرماں رواؤ
ہمیں تو مے کدے تک چھوڑ آؤ

امیرانہ بھی اس کوچے میں آؤ
لب و رُخسار و مژگاں کے گداؤ

اُبھرتی جا رہی ہے شمع کی لَو
بڑی نادان ہو ، ٹھنڈی ہواؤ

ہزاروں راز عُریاں ہو رہے ہیں
گِراؤ ، آنکھ پر چِلمن گراؤ

وُہ مجھ سے اور مَیں اُن سے خفا ہوں
ندیمو ، آ کے دونوں کو مناؤ

نہ جانے ہم کہاں گُم ہو چُکے ہیں
جو ممکن ہو تو ہم کو ڈھونڈ لاؤ

○
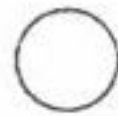
اُدھر اسی سے تقاضائے گرمیٔ محفل
اِدھر جگر کا یہ عالم کہ جیسے برف کی سِل

نہ جانے کون سی عجلت تھی اے تصوّرِ دوست
ابد کا لمحہ بھی مشکل سے ہو سکا شامل

ہم اپنے پاسِ روایاتِ عاشقی میں رہے
ہمارے پاس سے ہو کر گزر گیا محمل

ابھی اُمنگ میں تھوڑا سا خُون باقی ہے
نچوڑ لے غمِ دُنیا، نچوڑ لے غمِ دل

○

پہلے تو غمِ دل میں تھے خِرد سے بیگانے
ہم کو کون سا غم ہے، آج کل خدا جانے
آج اہلِ زنداں نے رت جگا منایا ہے
آج شہر والوں پر ہنس رہے ہیں دیوانے
ضبط اے دلِ بے تاب دُوسروں کی محفل ہے
لوگ اس کی پلکوں میں ڈھونڈ لیں گے افسانے
جب کبھی ستاروں کا کوئی نامہ بر آیا،
میرے در پہ دستک دی بار بار دُنیا نے
آج شہرِ لندن میں معرکے کی صُورت ہے
اک طرف تمہاری یاد، اِک طرف صنم خانے

○

سینے میں خزاں، آنکھوں میں برسات رہی ہے
اِس عشق میں ہر فصل کی سوغات رہی ہے

کس طرح خود اپنے کو یقیں آئے کہ اُس سے
ہم خاک نشینوں کی ملاقات رہی ہے

صُوفی کا خدا اور تھا شاعر کا خُدا اور
تم ساتھ رہے ہو تو کرامات رہی ہے

اتنا تو سمجھ روز کے بڑھتے ہُوئے فِتنے
ہم کچھ نہیں بولے تو تری بات رہی ہے

ہم ہیں تو یہ حیرانیٔ و شوریدگیٔ عشق
بچپن ہی سے منجملۂ عادات رہی ہے

اس سے بھی تو کچھ ربط جھلکتا ہے کہ وہ آنکھ
بس ہم پہ عنایات میں مُحتاط رہی ہے

الزام کسے دیں کہ ترے پیار میں ہم پہ
جو کچھ بھی رہی حسب روایات رہی ہے

کچھ میرؔ کے حالات سے حاصل کرو عبرت
لے دے کے اب اک عزّت سادات رہی ہے

○

گریہ تو اکثر رہا، پیہم رہا
پھر بھی دل کے بوجھ سے کچھ کم رہا
قمقمے جلتے رہے، بجھتے رہے
رات بھر سینے میں اک عالم رہا
اُس وفا دشمن سے چُھٹ جانے کے بعد
خود کو پا لینے کا کتنا غم رہا
اپنی حالت پر ہنسی بھی آئی تھی
اِس ہنسی کا بھی بڑا ماتم رہا
اِتنے ربط، اتنی شناسائی کے بعد
کون کس کے حال کا محرم رہا
پتھروں سے بھی نکل آیا جو تیر
وہ مرے پہلو میں آ کر جم رہا
ذہن نے کیا کچھ نہ کوشش کی مگر
دل کی گہرائی میں اک آدم رہا

کبھی تو کام زمانے کے سوگوار آئے
تجھے جو پا نہ سکے زیست کو سنوار آئے

تھا جس پہ وعدۂ فردوس و عاقبت کا مدار
وہ رات ہم سرِ کوئے بتاں گزار آئے

ترے خیال پہ شب خوں تو خیر کیا کرتے
بہت ہوا تو اک اوچھا سا ہاتھ مار آئے

متاعِ دل ہی بچی تھی بس اک زمانے سے
سو ہم اسے بھی تری انجمن میں ہار آئے

بڑے خلوص سے احوال پوچھنے کے لیے
گزر گئی شبِ فرقت تو میرے یار آئے

کسی کو حال بتانا ضرور ہی کیا تھا
اُس انجمن سے ہم اپنے قصور وار آئے

نگاہِ ناز مرے دل کے گھاؤ پہ مت جا
خدا کرے کہ تجھے اپنا کاروبار آئے

یہ اور بات کہ ساقی سے قرض مل نہ سکی
حضورِ حضرتِ یزداں تو بادہ خوار آئے

○

یہ ایک بات کہ اُس بُت کی ہمسری بھی نہیں
مبالغہ بھی نہیں، محض شاعری بھی نہیں

ہم عاشقوں میں جو اک رسم ہے مُروّت کی
تمہارے شہر میں از راہِ دلبری بھی نہیں

یہاں ہم اپنی تمنّا کے زخم کیا بیچیں؟
یہاں تو کوئی ستاروں کا جَوہری بھی نہیں

کسی کا قُرب جو مِلتا تو شِعر کیوں کہتے
فسردہ حالئ اربابِ فن بُری بھی نہیں

○

جو دن گزر گئے ہیں ترے التفات میں
مَیں اُن کو جوڑ لوں کہ گھٹا دوں حیات میں؟
کچھ مَیں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر گئی
دُنیا تو لطف لے گی مرے واقعات میں
میرا تو جرم تذکرۂ عام ہے مگر
کچھ دھجّیاں ہیں میری زلیخا کے ہات میں
آخر تمام عمر کی وسعت سما گئی
اک لمحۂ گزشتہ کی چھوٹی سی بات میں
اے دل ذرا سی جرأتِ رندی سے کام لے
کتنے چراغ ٹوٹ گئے احتیاط میں

کسی اور غم میں اتنی خلش نہاں نہیں ہے
غمِ دل مرے رفیقو، غمِ رائیگاں نہیں ہے

کوئی ہم نفس نہیں ہے، کوئی رازداں نہیں ہے
فقط ایک دل تھا اب تک سو وہ مہرباں نہیں ہے

مری رُوح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسّم مرا ترجماں نہیں ہے

کسی آنکھ کو صدا دو، کسی زُلف کو پکارو
بڑی دُھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائباں نہیں ہے

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے

○

کبھی جھڑکی سی کبھی پیار سے سمجھاتے رہے
ہم گئی رات پہ دل کو لیے بہلاتے رہے

اپنے اخلاق کی شہرت نے عجب دن دکھلائے
وہ بھی آتے رہے، احباب بھی ساتھ آتے رہے

ہم نے تو لُٹ کے محبّت کی روایت رکھ لی
اُن سے تو پوچھیے وُہ کس لیے پچھتاتے رہے

اُس کے تو نام سے وابستہ ہے کلیوں کا گداز
آنسوؤ تم سے تو پتّھر بھی پگھل جاتے رہے

یُوں تو نااہلوں کے سینے پہ جگر کٹتا تھا
ہم بھی پیمانے کو پیمانے سے ٹکراتے رہے

ان کی یہ وضعِ قدیمانہ بھی اللہ اللہ!
پہلے احسان کیا، بعد کو شرماتے رہے

یوں کسے ملتی ہے معمول سے فُرصت لیکن
ہم تو اِس لُطفِ غمِ یار سے بھی جاتے رہے

○

ہونٹوں کے ماہ تاب ہیں، آنکھوں کے بام ہیں
سر پھوڑنے کو ایک نہیں سو مقام ہیں

تم سے تو ایک دل کی کلی بھی نہ کھل سکی
یہ بھی بلاکشانِ محبّت کے کام ہیں

دل سے گزر خدا کے لیے اور ہوشیار
اِس سرزمیں کے لوگ بہت بدکلام ہیں

تھوڑی سی دیر صبر کہ اِس عرصہ گاہ میں
اے سوزِ عشق، ہم کو ابھی اور کام ہیں

تم بھی خُدا سے سوزِ جنوں کی دُعا کرو
ہم پر تو اِن بزرگ کے احسان عام ہیں

وہ کیا کرے جو تیری بدولت نہ ہنس سکا
اور جس پہ اتّفاق سے آنسو حرام ہیں

اپنے پہ آپڑیں تو نئے پن کی حد نہیں
جو واقعات سب کی حکایت میں عام ہیں

مُنعم کا تو خُدا بھی امیں، بُت بھی پاسباں
مُفلس کے صرف تیغ علیہ السّلام ہیں

○

اُسے چھو سکی نہ ظلمت، نہ ضیائے ماہ و انجم
مگر اے اداس شاعر ترا سرمدی ترنّم

مری نو بہار رُک جا، مری غمگسار رُک جا
ابھی سخت ہے اندھیرا، ابھی تیز ہے تلاطُم

مجھے کیا خبر تھی اس کی کہ کسی کو دیکھتے ہی
مرا ساتھ چھوڑ دے گا، مِرا بے وفا تبسّم

مرے ہونٹ جل رہے تھے، مرا دل سُلگ رہا تھا
وُہ سلام کر رہی تھی، مَیں کھڑا ہُوا تھا گُم سُم

مرے ضبط کی روش پر کہیں تم نہ بول اُٹھنا
کہیں مجھ سے چھِن نہ جائے مری حسرتِ تکلّم

غم اگر کرو تو اس کا کہ سماج ابھی وہی ہے
ارے یہ بھی کوئی غم ہے کہ نہ مل سکیں گے ہم تم

مری زندگی کی قدروں کی صفیں کھڑی ہُوئی ہیں
مرے دل سے ہو رہا ہے مرے ذہن کا تصادم

مرے نکتہ چیں مبصّر ابھی مُسکرا رہا ہے
تری جُوئے ناتواں پہ مری شاعری کا قلزم

○

ہر طرف انبساط ہے اے دل
اور ترے گھر میں رات ہے اے دل

عشق ان ظالموں کی دنیا میں
کتنی مظلوم ذات ہے اے دل

میری حالت کا پوچھنا ہی کیا
سب ترا التفات ہے اے دل

اس طرح آنسوؤں کو ضائع نہ کر
آنسوؤں میں حیات ہے اے دل

اور بیدار چل کہ یہ دنیا
شاطروں کی بساط ہے اے دل

صرف اُس نے نہیں دیا مجھے سوز
اس میں تیرا بھی ہات ہے اے دل

مندمل ہو نہ جائے زخمِ دروں
یہ مری کائنات ہے اے دل

حسن کا ایک وار سہ نہ سکا
ڈوب مرنے کی بات ہے اے دل

○

تم ہنسو تو دن نکلے، چُپ رہو تو راتیں ہیں
کس کا غم کہاں کا غم سب فضول باتیں ہیں

اے خلوص مَیں تجھ کو کس طرح بچاؤں گا
دشمنوں کی چالیں ہیں، ساتھیوں کی گھاتیں ہیں

تم پہ ہی نہیں موقوف آج کل تو دُنیا میں
زیست کے بھی مذہب ہیں، موت کی بھی ذاتیں ہیں

○

ناقِدو، دیدہ ورو، کُفر کا الزام نہ دو
میرے اِلحاد میں اِک پرتوِ الہام بھی ہَے

عشقِ خود دار، یہ پندارِ جنوں چھوڑ بھی دے
اب تو اُن آنکھوں میں آنسو بھی ہیں پیغام بھی ہَے

○

سُن اے حکیمِ ملّت و پیغمبرِ نجات
میرے دیارِ قلب میں کعبہ نہ سومنات
اک پیشۂ عشق تھا سو عوض مانگ مانگ کر
رُسوا اُسے بھی کر گئی سوداگروں کی ذات
ڈرتا ہوں یُوں کہ سچ ہی نکلتے ہیں بیشتر
اس کاروبارِ شوق میں دل کے توہُمات
محویتِ نشاط میں قُربت کے سو قرن
ٹُوٹی ہُوئی رگوں سے جُدائی کی ایک رات
تیرے غموں سے ایک بڑا فائدہ ہُوا
ہم نے سمیٹ لی دلِ مُضطر میں کائنات
اس راہِ شوق میں مرے ناتجربہ شناس
غیروں سے ڈر نہ ڈر مگر اپنوں سے احتیاط

عشقِ بتاں اس فکرِ معاش پہ اپنا رنگ جماتا گیا
ہم نے مانا کُنبہ دِلّی میں رہتا پر کھاتا گیا

پہلی بار کے عشق میں ایسا دیوانہ پن ممکن ہے
روز کی اس شوریدہ سری پہ کوئی ہمیں سمجھاتا گیا

دو دن کی یہ محفل ساقی رندوں سے ہنس بول کے کاٹ
ہم پھر اپنی راہ لگیں گے تیرا ہمارا ناتا کیا

یوں تو تم سے اپنی انا میں ہم نے کہا کیا کچھ لیکن
تم جاتے تو کیا رہ جاتا، ہم جاتے تو جاتا کیا

اِن سے سیدھے مُنھ ملیے تو اِن کے دماغ نہیں ملتے
سب کو دیکھ لیا ہے یارو، داتا کیا اَن داتا کیا

سیدھی سادھی عقل ہمیشہ مار ہی کھاتی آئی ہے
ہم بھی پیری مُریدی کرتے۔ تُو ہم سے اِتراتا کیا

○

وہاں مَیں نے رُودادِ غم ڈھونڈلی ہے، جہاں نالۂ مختصر بھی نہیں تھا
مَیں ایسے اُفق چھُو کے آیا ہُوں جن پر تخیّل کو اذنِ سفر بھی نہیں تھا

پس و پیش یوں میرے قدموں کی آہٹ کو اب اجنبی آنکھ سے دیکھتے ہیں
کہ جیسے یہ وُہ راہ ہے جس پہ کوئی مرے پیار کا منتظر بھی نہیں تھا

یہ سچ ہے کہ ان آنسوؤں کی چمک میں وُہ راتیں وہ صُبحیں اُبھرتی رہی ہیں
شب و روز کا یہ چراغاں مگر اک تری یاد پر منحصر بھی نہیں تھا

ترے شہر کے اور بھی واقعے ہیں ترے پیار کی اُلجھنوں کے علاوہ
وہاں وضعداری کی بات آگئی تھی جہاں چار تنکوں کا گھر بھی نہیں تھا

مجھے سوزِ دل کی اجازت عطا کر، نہیں تو زمانہ ہمیشہ کہے گا،
نگارِ سحر تیرے ماتھے کی بِندی میں تھوڑا سا خونِ جگر بھی نہیں تھا

اِسی روز مرّہ کی دُنیا میں ہم ایسے کچھ رند بھی تھے کہ جن کے جہاں میں
کچھ افواہِ سُود و زیاں بھی نہیں تھی، کچھ اندیشۂ بام و در بھی نہیں تھا

زمانہ بدستور ہنستا رہے گا، زمیں حسبِ معمُول جلتی رہے گی
اکیلے سفر کا اکیلا مُسافر اس انجام سے بے خبر بھی نہیں تھا

○

نگر نگر میلے کو گئے کون سُنے گا تیری پکار
اے دل، اے دیوانے دل! دیواروں سے سر دے مار

رُوح کے اس ویرانے میں تیری یاد ہی سب کچھ تھی
آج تو وہ بھی یوں گزری جیسے غریبوں کا تیوہار

اُس کے وار پہ شاید آج تجھ کو یاد آئے ہوں وُہ دِن
اے نادان خلوص کہ جب وہ غافل تھا ہم ہشیار

پل پل صدیاں بیت گئیں جانے کس دن بدلے گی
ایک تری آہستہ روی، ایک زمانے کی رفتار

پچھلی فصل میں جتنے بھی اہلِ جنوں تھے کام آئے
کون سجائے گا تیری مشق کا ساماں اب کی بار؟

صُبح کے نکلے دیوانے اب کیا لوٹ کے آئیں گے
ڈوب چلا ہے شہر میں دن پھیل چلا ہے سایۂ دار

منشور

ایک شُعلے کو طُور لکھتے تھے
آدمی ہو تو حُور لکھتے تھے

پہلے عُقبیٰ کی بات ہوتی تھی
حمد ہوتی تھی نعت ہوتی تھی

مُرغِ سِدرہ کا بال ہوتا تھا
حال ہوتا تھا قال ہوتا تھا

اور پھر داستانِ ہوش رُبا
دشتِ غُربت، کجا وہ لیلےٰ

داستانِ عجائبِ ایران
دیو و اژدر، فرشتہ و انسان

مدّتوں شاہِ سلطنت کا شکیب
آئے دِن کی مُراد، دل کے فریب

جشنِ میلاد پر چھنک پازیب
بارھویں سال میں کوئی آسیب

دینا ترجیح نِصف کو کُل پر
شیر کا کسب کو توکُّل پر

ایک عبرت پسند افسانہ
کسی تاجر اور اس کی طوطی کا

دعوےٰ ہُدہُد کا، زاغ کا اِعلان
عالِم نحو اور کشتی بان

حادثہ اک نہنگِ دریا کا
واقعہ رہزن و مُنیرہ کا

پہلے ہوتی تھیں حمد کی باتیں
ہم مگر کس کی حمد میں لکھیں؟

وہ کسی کا کہا نہیں سنتا
مولوی کی دعا نہیں سنتا

ہم تو عاصی ہیں ہم تو گندے ہیں
اُن کو دیکھو جو اُس کے بندے ہیں

اُس کی خلقت میں جس قدر ہیں نام
کس کو حاصل ہے اُن میں سے الہام؟

اس لیے بہرِ یک سلام و پیام
آؤ ڈھونڈیں اساتذہ کا کلام

میر صاحب کے باغ میں گھومیں
میرزا کی بیاض کو چومیں

یا ابھی اتنی دُور تک کیوں جائیں
کیوں نہ بادِ صبا سے کام چلائیں

اے صبا اے رفیقِ میر و حسن
ناشرِ واقعاتِ صحنِ چمن

حاملِ نکہتِ لب و رُخسار
قاصدِ حادثاتِ فصلِ بہار

پیکِ افسانہ ہائے مصر و عراق
غم گسارِ مریضِ شامِ فراق

اے کہ مشاطگی ہے تیرا اصول
اے شبستانِ ماورا کی رسول

اے کہ تجھ سے کوئی نہیں پنہاں
واقفِ رازِ خلوتِ انساں

لوگ رکھتے ہیں اِس زمانے کے
دانت کھانے کے اور دکھانے کے

عقل کی رہنمائی سے بدظن
جہل کے دوست، علم کے دشمن

دل کے کالے، زبان کے کچّے
سازشوں کے جنے ہوئے بچّے

لے کے چلتا ہے وقت کا دھارا
ان کی فرمائشوں کا پُشتارا
ان کے دشمن کو ماریہ لکھیے
یہ نہیں تو بہار یہ لکھیے
صاحبانِ کُلاہ اچھّے تھے
ان سے تو بادشاہ اچھّے تھے
طیش میں حکمِ قتل بھرتے تھے
طعن و تشنیع تو نہ کرتے تھے
آج ہیں مثلِ سرمُہر گلاس
سب خواص اور سب عوام النّاس
عقل کی پُوچھیے نہ جُثّے سے
یہ چھلکنے لگیں گے غُصّے سے

حُسنِ ظن تو نہیں اگر یہ کہوں
مَیں بھی تھوڑا شعُور رکھتا ہُوں
خصلتاً چُپ ہے تیرا جذباتی
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
میری نظموں کا ہے ہر اک انداز
میرے پورے وجُود کی آواز
دل پُر خوں ہے میری اِک اِک رگ
شاعرانہ مبالغوں سے الگ
میرے لہجے میں ڈھونڈتی ہے وقار
اقتصادی خیال کی رفتار
میری باتوں میں احتساب بھی ہے
میری نظموں میں انقلاب بھی ہے

ہاں مگر سوچتا ہوں مَیں اکثر
کیا یہ ہے آخری مقامِ نظر؟
یہ پُر اسرار تشنگی کیا ہے
فرد کیا شے ہے، زندگی کیا ہے

ذہن میں آگ ایسے سوتی ہے
جیسے روٹی کی بھوک ہوتی ہے

حدّتِ مہرِ تابدار ہے ذہن
ایک میدانِ کارزار ہے ذہن

دل کی سب سے بڑی دلیل ہے ذہن
ابدیّت کا سنگِ میل ہے ذہن

ذہن میں خواب بیج بوتے ہیں
ذہن کے اپنے شہر ہوتے ہیں

ذہن کو ہے خدا کی سی توفیق
ذہن کرتا ہے انجمن تخلیق

اے صبا اُن سے یہ بھی کہنا ہے
دِل کے ٹکڑے پہ ذہن گہنا ہے

تولتے ہیں جسے یہ اہلِ نظر
اورک اور پھٹکری کے کانٹے پر

اک طرف ضبط اک طرف جلدی
اِک طرف شعر، اک طرف ہلدی

عقل سوداگروں کی ہلچل میں
فکر جوشاندے کی بوتل میں

ماہرِ نفسیات و اہلِ نظر
ہینگ ملتے ہیں اب کسوٹی پر

آنسوؤں سے عرق بناتے ہیں
دھوپ دے کر حنا جلاتے ہیں

پر و پرواز سایۂ و کابوس
پھول کا نام جسدِ الکیموس

دِل میں اک پون انچ کی بتّی
فن بہ یک وزنِ ماشہ و رتّی

شاعروں سے شکایتی باتیں
ایسا لکھیے کہ ہم بھی کچھ سمجھیں

نامۂ شوق کا جواب آئے
شعر سے بوئے بد آب آئے

بار گزرے نہ درسِ مکتب پر — نظم ہو لکھنے کے مذہب پر

یوں تو ہر فلسفہ عبادت ہے — یوں تو مذہب بھی اک محبّت ہے
ہاں مگر اُن کے، میرے مذہب میں — تفرقے کی ہیں سینکڑوں باتیں
جب کبھی اُن کی ہار ہوتی ہے — زندگی بھر یہ بار ہوتی ہے
ایک لمحے میں پھینکتا ہے خون — اُن کے پورے وجُود کا قانون
گھورتی ہیں پھٹی پھٹی آنکھیں — اپنے احساس کی اِکائی میں
اور کچھ بھی نظر نہیں آتا — ایک ٹُوٹی ہُوئی کماں کے سوا
میرا مذہب خود اپنا مذہب ہے — عشق ہے، کائنات ہے، سب ہے
یہ نہیں ہے کہ اُس کی دُنیا سے — غم کے بادل کبھی نہیں گزرے
زیست میلہ نہیں ہے ہنستوں کا — تجربہ ہے اِسے شکستوں کا
بارہا میرے اپنے سینے میں — کٹ چُکی ہیں ہزار ہا گرہیں
غم کہ ہے اِک خیال اِک افسوں — مَیں اُسے اُنگلیوں سے چھُوتا ہوں
یعنی نشتر جو کاٹ دے رگ وپے — میری نس نس میں ہوتا آیا ہے
مَیں نے لیکن لہو کے دامن میں — ڈال دی ہیں خیال کی کرنیں
رات لے کر سحر سجائی ہے — زخم پہ ہنس کے جیت پائی ہے

چھین کر آنسوؤں سے موت کی آگ
ہر تبسّم کو دے دیا ہے سُہاگ

دِل گنوایا ہے، تیر کھایا ہے
عِشق کو جاوداں بنایا ہے

ایک منزل، شعُور اور وِجدان
ذہن اور دل کی ایک ہی میزان

اور یہ صاحبانِ سوزِ دُرُوں
عِشق کو دِل میں مانتے ہیں جنُوں

اور ایسا جنُوں کہ جس کا مکان
یا کِتابیں ہیں یا فقط ہذیان

عِشق ہے اُن کی ایک رسمی لَے
اور اپنا تو سارا نغمہ ہے

زخم تلووں میں چند رکھتے ہیں
ہم مگر سر بلند رکھتے ہیں

دِل ڈراتی ہے کھینچتی ہے کماں
دو گھڑی کی سیاستِ درباں

ہم کو لیکن لگن بھی آتی ہے
یار کی انجمن بھی آتی ہے

ہر زمانے میں ہم پہ حرف آئے
ہم نہ اپنے کیے پہ پچھتائے

حرف رکھنا انہی کو بھاتا ہے
"ہم کو غصّے پہ پیار آتا ہے"

جس جگہ یہ کنول جلاتے ہیں
ہم وہاں کونپلیں اُگاتے ہیں

راستے سخت، منزلیں بے نام
دل نہیں ہارتے، جنُوں کے امام
زیست سہ لے گی رات کا ہر وار
جگمگائیں گے چاند سے رُخسار

آنچ پڑتی رہے گی ہر فن پر
تاب آتی رہے گی کندن پر
خوں پیے گی زمین گلشن کی
ساکھ بڑھتی رہے گی ساون کی
جشنِ بادِ صبا نہیں رُکتا
پھول کا قافلہ نہیں رُکتا
جب کبھی پھول سوکھ جاتے ہیں
اور آتے ہیں — اور آتے ہیں

موجِ مری صدف صدف

موج مری صدف

مصطفیٰ زیدی

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی) ۔ لیک روڈ۔ لاہور

اپنے مرحوم بھائی

مجتبیٰ زیدی

کے نام

تم کہاں رہتے ہو اے ہم سے بچھڑنے والو!
ہم تمہیں ڈھونڈنے جائیں تو ملو گے کہ نہیں
ماں کی ویران نگاہوں کی طرف دیکھو گے؟
بھائی آواز اگر دے تو سُنو گے کہ نہیں

دشتِ غربت کے بھلے دن سے کبھی جی ڈرتا ہے
کہ وہاں کوئی نہ مونس نہ سہارا ہو گا
ہم کہاں جشن میں شامل تھے جو کچھ سُن نہ سکے!
تم نے ان زخموں میں کس کس کو پکارا ہو گا

ہم تو جس وقت بھی، جس دن بھی پریشان ہوئے
تم نے آکر ہمیں محفوظ کیا، راہ دکھائی
اور جب تم پہ بُرا وقت پڑا تب ہم لوگ
جانے کس گھر میں، کہاں سوئے ہوئے تھے بھائی

(۲)

ہم تری لاش کو کاندھا بھی نہ دینے آئے
ہم نے غربت میں تجھے زیرِ زمیں چھوڑ دیا
ہم نے اس زیست میں بس ایک نگیں پایا تھا
کسی تربت میں وہی ایک نگیں چھوڑ دیا

(نامکمل .... وہ نوحہ جو کبھی مکمل نہیں ہو سکتا)

ترتیب

تلپھے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

چکبست نے (جن کا حوالہ دینا کوئی ایسی معز زبات نہیں) ایک شعر میں اپنے غم و غصہ کا اظہار یوں کیا ہے ؎

ہوا مزاج کا عالم یہ سیرِ یورپ سے
کہ اپنے ملک کی آب و ہوا کو بھول گئے

ممکن ہے کوئی اس شعر پر شرمندہ ہوا ہو، اور کسی نے اس سے عبرت حاصل کی ہو۔ مجھے ان دونوں کی توفیق نہیں ہوتی۔ اپنے ملک کی آب و ہوا تو خدا کے فضل سے اتنی نرم و گرم ہے کہ اسے کون بھلا سکتا ہے لیکن سیرِ یورپ سے جو اضافی قدروں کی تھوڑی بہت سوجھ بوجھ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہی لے ڈوبتی ہے اور اسی کے طفیل کوئی اکبر الہ آبادی کا ولین بن جاتا ہے اور کوئی چکبست کا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہم پچیس آدمیوں کا مختصر لیکن مختلف النوع قافلہ جب لندن پہنچا تو کسی کا کچھ ردِ عمل ہوا اور کسی کا کچھ۔ مثلاً ایک صاحب نے بی بی سی کے انٹرویو میں اپنا بیان دیتے ہوئے کہا کہ "جناب ہم تو مجسم ہیں جو یہاں آکر ہم کو یہ دیکھنا پڑ رہا ہے کہ "بے نقاب" عورتیں" نامحرم مردوں کے ساتھ شاہراہ عام پر گھومتی پھرتی ہیں"۔ اس بیان کا اگر اس لطیفے سے مقابلہ کیجئے کہ صاحب لندن میں جو بات مجھے سب سے زیادہ عجیب معلوم ہوئی وہ یہ کہ یہاں کا بچہ بچہ انگریزی بولتا ہے"۔ تو لطیفہ ہیچ معلوم ہو گا۔

بس ایک ہم تھے اور ایک ارشاد بھائی جن کو بے نقاب عورتوں کا نامحرم مردوں کے ساتھ گھومنا معیوب نہیں معلوم ہوا اور اس پر دبی دبی زبان سے لندن میں یہ شعر ہوا تھا ؎

کچھ لوگ اک گلاس بیئر میں بہک گئے
ہم وہ ستم ظریف کہ وسکی چڑھی نہ رم

اس طرح کے بہت سے شعر، بہت سی غزلیں اور بہت سی نظمیں لکھنے کے مواقع آئے۔ بیشتر ایسے اشعار ہیں جو سینہ بہ سینہ چلتے ہیں اور کبھی نہیں چھپ سکتے اس لئے کہ لکھنے والے نے

چاہے کتنے ہی خلوص سے اور کتنے ہی غیر جذباتی طریقے سے کیوں نہ لکھا ہو، جس کسی کو ان اشعار میں اپنی صورت نظر آتی ہے وہ خفا ہوتا ہے آئینے کو سیاہ اور مزاج کو تحقیر سمجھتا ہے، کہ اندازِ دلبری یہی ہیں!

۱۵ مئی ۱۹۵۶ء کو میں نے اپنا اگلا پچھلا اثاثہ جوڑ کر اور تمام ہندسوں کی تفریق کو پورا ہندسہ سمجھ کر، فورڈ کمپنی سے ایک چھوٹی سی دس ہارس پاور کی پریفکٹ خرید لی۔ چنانچہ اس مجموعے میں جو غزل یوں ہے کہ ؎

کوئی رفیقِ بہم ہی نہ ہو تو کیا کیجے
کبھی کبھی ترا غم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

اس میں اس وقت یہ شعر بھی ہوا کرتا تھا ؎

زفائرسکس پہ مرنے کو ہم بھی مرتے ہیں
گرہ میں دام و درم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

یہ کار خریدنے کے بعد جو منصوبہ تھا کہ یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کا سفر اسی پر ہوگا - وہ بالکل مکمل ہو گیا اور ارشاد بھائی اور میں اس منصوبہ کے فریقین طے پائے - جب اگست میں چلنے چلانے کا زمانہ آیا تو ایک اور رفیق کار فتح خان بندیال بھی آملے اور کارواں بنتا گیا فتح خان بندیال نے ہمراہ صرف بغداد تک سفر کیا اور وہاں سے پریفکٹ کو حقیر فقیر سمجھ کر بی اے او سی کے طیارے پر کراچی روانہ ہو گئے اور سفر کو ابتدا سے انتہا تک پہنچانے کا سہرا ارشاد بھائی کے اور ہمارے سر ہی رہا۔

اس سفر کی طویل حکایت کا یہ مقام نہیں - اس تمام پیش بندی کا بھی صرف یہ مقصد تھا کہ اس مجموعے کی اکثر نظمیں قیامِ انگلستان یا سفرِ یورپ کے زمانے کی ہیں اور ان سے ذہن کی ایک خاص فضا مرتب کی جا سکتی ہے لیکن یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ان لفظوں میں "پیامِ مشرق" کا جواب "پیامِ مغرب" اور "توشب آفریدی، چراغ آفریدم" والا موڈ نہیں ہے بلکہ چند تاثرات ہیں، چند خاکے، آنسوؤں کی دھندلاہٹ بھی ہے اور مستقبل کا خواب بھی ہے - اگر کوئی ایک اکیلی نظم ان تمام باتوں کا خلاصہ ہے تو وہ "شہرِ آذر" ہے اور اسی اہمیت کے پیشِ نظر میں نے

اسی عنوان سے علیحدہ کتاب چھاپنے کا فیصلہ کیا تھا اور اسی لئے اس مجموعے میں یہ نظم دوبارہ شامل کی گئی ہے۔

میں نے جو تھوڑی بہت دنیا دیکھی ہے اور اپنوں اور غیروں کے ساتھ گذاری ہے۔ اس سے میرے لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہے کہ محض مشرق کی دہائی دے کر کوئی نہ کوئی نقاد اس مجموعے کو بغیر پڑھے بدنام کرا سکتا ہے۔ بلکہ ایک چھوٹے سے پیمانے پر ایسا ہوا بھی ہے۔ ایک صاحب نے جو کئی اخباروں، رسالوں کے مدیر اور شاعر، مضمون نگار وغیرہ وغیرہ ہیں۔ مجھے خط میں لکھا تھا کہ آپ نے شکست، فرار، انتقام والی نظم میں اپنے اسی زمین کے دوستوں کا جو مذاق اڑایا ہے وہ نہ آپ کو زیب دیتا ہے نہ آپ کے حق میں اچھا ہے۔ بہرحال "شریکِ حیات" (یہ نظم شہر آذر میں شامل ہے) کی بات بھی چونکہ درمیان میں آ گئی ہے اس لئے آپ کو صرف مبارکباد دیتا ہوں"۔ میرے حق میں اچھا نہ ہونے والی جو دھمکی ہے اس کے تو نہ جانے کیا معنے ہیں لیکن اتفاق دیکھئے کہ "شریکِ حیات" عنوان کی نظم میں نے یورپ جانے سے چھ سال قبل لکھی تھی، اسی طرح اور بھی چند اصحاب نے میرے یورپ کے ردِ عمل ان نظموں میں ڈھونڈے ہیں جو کافی عرصہ پہلے کی ہیں۔ ایمانداری کی بات تو یہ تھی کہ میں ان تمام نظموں، غزلوں پر تاریخیں درج کر دیتا لیکن اس طرح ایک لطف سے محروم ہونے کی گنجائش نکل آتی۔

ہمارے سفر کا جغرافیہ یہ تھا۔ انگلستان۔ فرانس (دوور۔ کیلے۔ ایملین۔ پیرس۔ ریلنز)۔ بلجیم۔ ہالینڈ۔ جرمنی (کولون۔ فرینکفرٹ۔ میونخ) سوئٹزرلینڈ۔ دوبارہ فرانس (جنوبی سمت۔ مانٹے کارلو)۔ اٹلی (میلان۔ جینو۔ فلورنس۔ روم۔ وینس)۔ آسٹریا۔ یوگوسلاویہ (ٹریسٹ۔ زغرب۔ بلگریڈ) یونان (ایتھنز۔ تھسولونیکا)۔ ترکی (استنبول۔ انقرہ)۔ سیریا۔ لبنان (بیروت دمشق)۔ جارڈن۔ عراق۔ فارس (زنزیار بتیں) پاکستان (کوئٹہ)۔

جب ہم انگلستان سے نکلے تھے اور اس دکھ اور درد کے ساتھ جیسا کہ اپنے وطن کو چھوڑتے وقت محسوس ہوتا ہے، جیسے دل کی کشتی اس گہرے نیلے پانی کے دھاروں پر ایک بار پڑ گئی تو نہ جانے کدھر نکل جائے ؎

نگر نگر کے خواب میں گم ہیں ڈوور کے ملاح
میں ان خوابوں کے مبہم سناٹے سے آگاہ
اونچی لہریں، بڑھتا دریا، نیچی شہر پناہ (ڈوور)

اس کے ساتھ ساتھ یہ امکانات بھی تھے ؎

شاید اس طوفان میں ساری بنیادیں ہل جائیں
یا مشرق اور مغرب کے ساحل اک دن مل جائیں

خدا کا شکر ہے کہ ڈوور سے چلنے اور کوئٹے پہنچنے والے لمحے کے درمیان "یورپ لعید" اور مشرق وسطیٰ بھی آگئے اور دل کو یہ تسلی ہوئی کہ ہم اپنے ملک میں ہزار خواب بھی لیکن اکثر سے اچھے ہیں ورنہ اگر کہیں ہم بھی بی اے او سی کے طیارے سے سیدھے واپس پہنچ جاتے تو کسی رات بھی نیند نہ آتی۔

ہم نے دو سو سال انگریز کی غلامی کی۔ لیکن جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ ہم پر حکومت کرنے والا انگریز اور انگلستان میں رہنے والا انگریز دو مختلف قومیں ہیں۔ ایک میں نشہ تھا، غرور تھا، فراست و تدبر کے ساتھ دوسرے کو محکوم بنائے رکھنے کی سیاست تھی۔ دوسرے میں دیانت، بردباری، ضبط اور مکمل جمہوریت تھی۔ اسی تضاد کی طرف یہ اشارہ ہے۔ ؎

کس طرح یقیں آئے کہ اس ذہن نے اک روز
دانستہ روا رکھے تھے تخریب کے آداب؟
کس طرح یقیں آئے کہ ہو گی تجھے منظور!
توصیفِ شبِ ہجر و نوائے دلِ بیتاب؟
اے نزہتِ مہتاب!
(اے نزہتِ مہتاب!)

یہ تو ان کا اپنا تضاد تھا۔ دوسرا تضاد ان کا اور ہمارا ہے۔ اس کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان کے برعکس، نہ ہماری خوشی خوشی کی طرح ہوتی ہے اور نہ غم، غم کی طرح، ہم سب خدا کی سلطنتِ جبر و اختیار میں مضمحل اور سوختہ حال اور نیم فردا سے بے نیاز بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں رسمِ دل کے مطابق نہیں، بلکہ لہر کی آغوش میں رہنے کے باوجود لہروں سے بچ

کر۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس کی رسم حلقۂ دار و رسن سے گزرے بغیر نہیں چل پاتی۔ یہ ساری باتیں مجھے ہیبل کا سل کی ایک شام اور یورپ کی ہر شام نے سمجھائی ہیں۔

"شہرِ آذر" کے بعد جو نظم ان دو ثقافتوں کی مختلف طبعیتوں کا عکس پیش کرتی ہے وہ "فرار، شکست، انتقام وغیرہ" ہے۔ میں اس نظم کے بارے میں یہ سمجھتا ہوں کہ بیک وقت یہ میری سب سے زیادہ ذاتی اور سب سے زیادہ غیر ذاتی نظم ہے۔ اس نظم میں مشرق اور مغرب کا بُعد بھی ہے۔ وہ یکجائی بھی ہے جہاں سب ایک ہی حمام میں ننگے ہو جاتے ہیں۔ مہاتما جی سے سانز علیہ السلام تک ؎

مشرق کے پنڈت، مغرب کے گرجا والے
صبح ہوئی اور سچائی کے پیچھے بھاگے
سچائی ایک قحبہ تھی جو رات کو تھک کر
سوئی ہوئی تھی شور سنا تو خوف کے مارے
تھر تھر کانپی، روزِ عدالت سے گھبرائی
روپ بدل کر پیچھے نکلی آگے آگے!
مشرق کے پنڈت مغرب کے گرجا والے

(فرار، شکست، انتقام)

(۲)

یوں تو ہر شخص کو اپنے ماں، باپ، بھائی، بہنوں سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن اکثر خاندانوں میں کوئی نہ کوئی ایک شخص ایسی ہمہ گیر شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ جو تمام خاندان کا مرکز بن جاتا ہے۔ میرے بڑے بھائی مجتبیٰ زیدی میرے لئے صرف بھائی نہیں تھے بلکہ ماں اور باپ بھی تھے اور کتنے ہی دوسرے لوگ بھی ان کے متعلق اسی طرح سوچتے تھے۔ اگست ۱۹۵۷ء میں جس طرح کا سفر میں نے کیا تھا اسی طرح کے سفر سے وہ بھی انگلستان سے واپس آرہے تھے۔ مشہد تک پہنچ چکے تھے۔ جب ان کی کار کا ایک بس سے حادثہ ہوگیا۔ جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ یہ سانحہ میرے اور بہت سے لوگوں کی زندگیوں میں جتنا انقلاب انگیز اور روح فرسا تھا اس کا اظہار میرے بس کی بات نہیں۔ یہ کتاب اسی مرحوم بھائی کے نام معنون ہے۔ جس کی موت کا یقین نہیں آتا۔ اور جس کے بعد اپنی زندگی بیکار، بے معنی اور موت سے بدتر معلوم ہوتی ہے۔

گذرنے والوں میں کتنے جگر فگار تھے آج
فقیرِ راہ ہیں ہم، ہم کو کیا نہیں معلوم

صبا چلی تو ہے اس بار جھولیاں بھر کے
کسی کو راس بھی آئے گی یا نہیں معلوم

ہمیں بھی راہ میں اک دن تمہارا خانہ بدوش
نظر تو آیا تھا لیکن پتہ نہیں معلوم

بہت سے وہ ہیں جو بارِ سفر اٹھا نہ سکے
بہت سے وہ ہیں جنہیں راستہ نہیں معلوم

اندیشہ ہائے دور دراز

اس سے پہلے بھی اس محفلِ رقص میں گھنگروؤں کے چھناکے بکھرتے رہے
قبل اور وسط اور حال کے قافلے سب اسی راستے سے گذرتے رہے
مندروں میں کھنکتی رہیں گھنٹیاں مسجدوں کے منارے ابھرتے رہے

اس سے پہلے بھی آسودگی کیلئے آسماں کی طرف آنکھ اٹھتی رہی
اس سے پہلے بھی حسنِ سفر کیلئے کہکشاں کی طرف آنکھ اٹھتی رہی
اس سے پہلے بھی انسان کے نکتہ چیں اعتقادات کی بات کرتے رہے

خوبصورت سی اک ناؤ دے کر سخن گر نے لہروں کے چکر میں الجھا دیا
معتبر رہنماؤں نے دھوکے دیئے خضر صورت بزرگوں نے بہکا دیا
خضر صورت بزرگوں کی آنکھوں میں تقدیس کے سرخ ڈورے ابھرتے رہے

آدمی کے تراشے ہوئے وہم نے آدمی کے لئے خار و خس چن دیئے
قیصروں سے غلامی کا تمغہ ملا دیوتاؤں نے افلاس کے ہن دیئے
پاک پروردگار رحمہ و مہر کی رحمتوں سے اندھیرے نکھرتے رہے

چشمِ مشتاق کو رُخ کی تابانیاں دیکھنے کی سعادت نہیں مل سکی
شام گزرے بھی مدت ہوئی اور ابھی آئینے کو اجازت نہیں مل سکی
صبح بھی تجھ سے پوچھیں گے اے دردِ دل تیرے گیسو کہاں تک سنورتے رہے

مارگرٹ

محل کے در پہ کلیسا کے طاقِ کہنہ میں
کہاں کہاں نہ چراغاں ہوا دلِ بے تاب
پھر ایک بار کسی بے ستون کا پتھر
مزاجِ تیشہ کا پرساں ہوا دلِ بے تاب
وہی قدیم کہانی نئے سرے سے چلی
وہی روش وہی عنواں ہوا دلِ بے تاب
تمام رات بکنگھم میں دیپ جلتے رہے
تمام رات شہیداں ہوا دلِ بے تاب
جو لوریوں کے ترنم میں سج کے آتا تھا
وہ خواب خوابِ پریشاں ہوا دلِ بے تاب
کئی لباس تھے پر صرفِ چاک ہونے کو
ہم عاشقوں کا گریباں ہوا دلِ بے تاب

ابھی جب اپنی عنایات کا خیال آیا
سُنا ہے حُسن پشیماں ہوا دلِ بے تاب
نہ یہ کہ بات فقط ٹاؤن ڈ پر گزری
کسی کا ہم پہ بھی احساں ہوا دلِ بے تاب

ایک عصرانہ

جانِ محفل ترا اندازِ سخن جو کچھ ہو
تیری افتاد، ترے دل کی جلن جو کچھ ہو
تجھ کو آتا ہو ستاروں سے کنایہ کرنا
تو نے سیکھا ہو خداؤں کو رعایہ کرنا
لفظ کی اوٹ میں کھلتے ہوں معانی کیا کیا
بات بنتی ہو اشاروں کی زبانی کیا کیا

آج ٹوٹا یہ طلسمِ لب و سحرِ امکاں
جب تری جنبشِ ابرو سے نہ چٹکیں کلیاں
تو نے تسخیر و تعلق کے لئے کیا نہ کیا
اس نے اظہار تو کیا وہم تمنا نہ کیا
اے کہ تو شمعِ سرِ طور ہے کاشانوں میں
نام بھی اس نے نہ پوچھا ترا مہمانوں میں

فرار، شکست، انتقام وغیرہ وغیرہ

(ہر شاعر اور ہر عاشق کے علاوہ سنجیدگی سے خود اپنی عبرت کیلئے)

حصّہ اوّل :-

اچھا ہوا کہ رسمِ مروت بھی اُٹھ گئی
اچھا ہوا کہ آنکھ کا پانی بھی ڈھل گیا
تاروں میں جس خلوص کے نکھرے تھے خدوخال
وہ دن کی تیز دھوپ میں آیا تو جل گیا

اک لمحہ جاوداں نہ اگر ہو سکا تو کیا
ہم کو شکستِ حرفِ تمنا کا غم نہیں!
آئینِ سنگ باریٔ فطرت کا رنج ہے
شیشوں کے سوگوار مسیحا کا غم نہیں

اب یہ تو ہے کہ قصہ فرہاد پہ ہمیں
وحشت نہ ہوگی لوٹ کے رونا نہ آئیگا

پروائے ننگ و نام رہے گی جو کل نہ تھی
دل کو دیارِ غیر میں کھونا نہ آئے گا

احساس تو رہے گا کہ ہر ایک بات پر
ہم ہی غلط ہیں سارا زمانہ غلط نہیں
سینہ فگار ہے تو ہمارا قصور ہے
آقائے دوجہاں کا نشانہ غلط نہیں

ہر "خیر خواہ" کو دلِ ناداں نے آج تک
"ناصح" کہا "حکیم" کہا "محتسِب" کہا
ہر "باشعور" دوست پہ سو پھبتیاں کسیں
"زندی" کو "فہم" "خانہ خرابی" کو "طِب" کہا
ماضی کے قیس آج کے ہم دونوں سائیکوج
اسٹیکل اور فرائڈ کے کردار عام ہیں
یکتائے روزگار نہیں ہم میں ایک بھی
ہم لوگ صرف اپنی نظر میں امام ہیں

سب کچھ گنوا کے آج فقط یہ پتہ چلا
آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے دھوئیے
دنیا میں مہ لقاؤں کی کوئی کمی نہیں
کس کس پہ جان دیجیے کس کس کو روئیے

ایک قطعہ اسی سلسلے میں

جسے چاہے اسے دے آمریت
متاعِ خم کی ناپیدی نہیں ہے
بہت ہے یوں تو اس کے میکدے میں
برائے مصطفےٰ زیدی نہیں ہے

حصہ دوم :-

(زبانِ یارِ من ....)

SELF——— PITY
ISN'T WITTY
IT JUST STINKS
WHILE MONOTONOUS RELATION
OF ONE'S SELF DEPRECIATION
MEANS ACCEPTANCE, IN THE END OF——
ONE'S WORD

حصّہ سوئم

کچھ عشق کی افتاد تھی کچھ حسن کی توصیف
پہلے تو ہر اک نظم میں اک ڈھنگ تھا اک طور
ہر شاعرِ امروز پہ لازم ہوئی جب فکر
ہم نے بھی کئی ایسے مسائل پہ کیا غور
اس طرزِ تفکر سے ہوا ذہن میں آغاز
شکووں کا اک انبار شکایات کا اک دور
اس قسم کے شکوے کہ جو جائیں تو کہاں جائیں
انسان تو انسان ہے لندن ہو کہ لاہور
اس قسم کے شکوے کہ جواں تھا ابھی زیدی
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

اس قسم کے شکوے کہ

یونان کی زمین نے ہذیان و کرب میں
اک اندھے دیوتا کو جنم کس لئے دیا؟
جو بادِ تند و دستِ صبا دیکھتا نہیں
انسان دیکھتا ہے خدا دیکھتا نہیں

مری زباں پہ تانبے کا ذائقہ کیوں ہے

مرا ستارہ کدھر جگمگا کے ڈوب گیا؟

نہ جانے سوزِ طبیعت نہیں کہ آہ نہیں

ردائے ابر کے پیچھے نگارِ ماہ نہیں

نہ جانے کیسی ہے اب ارضِ خاک کی صحت

دعا کریں نہ کریں، التجا کریں نہ کریں

مشرق کے پنڈت، مغرب کے گرجا والے

صبح ہوئی اور سچائی کے پیچھے بھاگے

"سچائی" اک قحبہ تھی جو رات کو تھک کر

سوئی ہوئی تھی شور سنا تو خوف کے مارے

تھر تھر کانپی، روزِ عدالت سے گھبرائی

روپ بدل کر پیچھے نکلی، آگے آگے

مشرق کے پنڈت، مغرب کے گرجا والے

اب تک ہمارے ساتھ رفیقانِ جستجو
کچھ موت، کچھ حیات کے ہمراہ آئے تھے
ہم ایسے بد نصیب کہ میخانہ دیکھنے
یاروں کے التفات کے ہمراہ آئے تھے

یوں ہم کہاں، شراب کہاں لیکن ایک شام
کچھ یار دوست ساتھ تھے کچھ ہم اداس تھے
اس کی نظر کے فیض سے غم اور بڑھ گیا
پہلے بھی تھے اُداس مگر کم اُداس تھے

اس اداس کمرے میں
رات کیسے گزرے گی
نیند کیسے آئے گی

میری مضمحل ہمدم

آج میری پلکوں پر

تیری انگلیوں کا لوچ

سسکیاں سی بھرتا ہے

ٹیٹ گیلری کے بُت

کیو گارڈن کے پھول

ٹیمز کی سبک لہریں

خوں فگار ٹاور کے

وہم آزما کوّے

ایسٹ انڈ کی دنیا

فینچلے کے ریستوراں

ویسٹمنسٹر کے گیت

جیمز پارک میں تیرے

قُرب کی جواں دھڑکن

انتظار کے پودے

اعتبار کی شبنم!

میری مضمحل ہمدم
تیرا غم نہ اپنا غم
اس اداس کمرے میں
رات کیسے گزرے گی
نیند کیسے آئے گی

دوستو اِس جشنِ عالم کے سنہرے دور میں
انفرادی آنسوؤں کی آگ کا غم مت کرو
ایک سورج بادلوں میں کھو گیا تو کیا ہوا
کھڑکیاں کھولو، گھروں کی روشنی کم مت کرو
یہ لہو گندا لہو تھا اس سڑک کو چھوڑ دو
رفتگاں کی ٹوٹتی کڑیوں کا ماتم مت کرو

اندھیرے کی سنسان لہروں کے پیچھے

ذرا سا جزیرہ

ذرا سے جزیرے میں دو چار سائے

دھندلے کی صُورت

اندھیرے کی مورت

جو حسرت کو سمجھے نہ خوابوں میں جائے

دھوئیں اور مٹی میں مکڑی کے جالے

یہ رُوحیں، یہ گھر، یہ محل، یہ شوالے

کوئی اپنے کاندھوں پہ کیا کچھ سنبھالے

اس قسم کی باتیں کہ :-

یارو خدا کا خوف کرو، خوش رہا کرو

دشمن کی دوستی سے ڈرو، خوش رہا کرو

یہ بھی نہیں ضرور کہ بے حد ہنسو مگر

رو رو کے میکدہ نہ بھرو، خوش رہا کرو

مرتے ہو، دوسروں کو تو جانیں عزیز ہیں

آشفتہ حالو، خفتہ سرو، خوش رہا کرو

وہ آگہی کہ زلف نہ زنجیر دیکھئے
وہ معرفت کہ کون و مکاں گردِ رہگذار

وہ منزلِ گداز کہ حرفِ سکوت بار
وہ روشنی کہ دوست کی تصویر دیکھئے

ماہیت

میں سوچتا تھا کہ بڑھتے ہوئے اندھیروں میں
افق کی موج پہ اُبھرا ہوا ہلال ہو تم
تصورات میں تم نے کنول جلائے ہیں
وفا کا روپ ہو احساس کا جمال ہو تم
کسی کا خواب میں نکھرا ہوا تبسّم ہو
کسی کا پیار سے آیا ہوا خیال ہو تم
مگر یہ آج زمانے نے کر دیا ثابت
معاشیات کا سیدھا سا اک سوال ہو تم

آسماں زرد تھا

اے کلی تجھ کو ہمارا بھی خیال آ ہی گیا
ہم تو مایوس ہوئے بیٹھے تھے صحراؤں میں
اب ترا روپ بھی دُھندلا سا چلا تھا دل میں
تو بھی اک یاد سی تھی جملہ حسیناؤں میں
تہ بہ تہ گرد سے آلود تھا دن کا دامن
رات کا نام نہ آتا تھا تمنّاؤں میں

رقصِ شبنم کی پرستار نگاہوں کے لئے
دُھوپ کے ابر تھے خورشید کی لو چھائیں تھیں
آسماں زرد تھا جیسے کوئی یرقاں کا مریض
جس کے تکیے کے لئے ریت کی دستاریں تھیں
دل بھرا رہتا تھا جلتے ہوئے چھالے کی طرح
روح کے واسطے دلیواریں ہی دلیواریں تھیں

کوئی آواز نہ آتی تھی بہ جز صوتِ مہیب
کوئی نغمہ نہ تھا چیلوں کے ترنم کے سوا
سارا انداز تھا پھیلے ہوئے دریاؤں کا
ریگِ صحرا کے سمندر میں تلاطم کے سوا
خشک پتوں کا نمک ریت کے ذروں کی مٹھاس
ہونٹ سب ذائقے رکھتے تھے ترنم کے سوا

کب تک اس دل کی لگن راس نہ آتی آخر
مسکراتا ہوا گردوں پہ ہلال آ ہی گیا
اپنے دیوانوں کو سینے سے لگانے کے لیے
اک غزل پیکر و افسانہ جمال آ ہی گیا
اے فلک تو نے ہمیں خاک سے آخر کو چنا
اے کلی تجھ کو ہمارا بھی خیال آ ہی گیا

پولونیئس

(شیکسپیئر کہانی کا ایک ویلن)

میں اس افسانے کا کردار ہوں جس کا ہیرو
عرش پر چلتا ہے تاروں پہ قدم رکھتا ہے
اس کی تحویل میں یونان کے بُت رہتے ہیں
وہ کنیزوں میں نگاران عجم رکھتا ہے
تخت و طاؤس و طرب زار و غزال و نکہت
دیر و فردوس و صنادید و حرم رکھتا ہے

وہ اس افسانے کا ہیرو ہے جس افسانے میں
میں جب آتا ہوں تو بے جیب و قبا آتا ہوں
رنگ اور نور کے سیلاب میں میری صورت
آئینہ دیکھنے لگتا ہے تو شرماتا ہوں
دن گذرتا ہے نئے زخموں کو گنتے گنتے
رات آتی ہے تو ہر زخم کو سہلاتا ہوں

وہ تو بس ایک ہے اور مجھ سے گریباں بیزار
اتنی تعداد میں ہیں جیسے کہیں مور و مگس
ہیملٹ اس کے لبادے کے تلے چلتا ہے
اور مرے دل میں دھڑکتا ہے سوالوں کا جرس

آخر اک عمر کی محنت تیرے کس کام آئی
اس بڑھاپے کی سعادت ترے کس کام آئی
تیری بچی کو بہا لے گئی چھوٹی سی ندی
سینکڑوں سال کی حکمت ترے کس کام آئی

میں اس افسانے کا کردار ہوں جس کے کردار
اک ذرا دھوپ میں نکلیں تو پگھل کر رہ جائیں
خواب اور کہر کی آغوش میں رہنے والے
وقت کی آنچ میں آ جائیں تو جل کر رہ جائیں
ہم کسی اور شب و روز سے مانوس نہیں!
اپنی اقلیم سے نکلیں تو نکل کر رہ جائیں

اسی خطرے سے نہ ماضی کی طرف آنکھ اٹھی
مڑ کے دیکھیں گے تو بن جائیں گے ہم سنگِ نمک
نہ کوئی غم، غمِ تاباں نہ مسرت بے لوث
اپنے امروز پہ تنقید نہ فردا پہ کسک
یہ چمکتی ہوئی باتیں یہ دمکتا ہوا ذہن
محض غازے کی عنایات فقط نوکِ پلک

صرف میرے دلِ شوریدۂ ناشستہ کو
کچھ نہ کچھ بننے کی حسرت تھی مگر بن نہ سکا
ایک شعلے کو بھی حاصل نہ ہوا رقصِ دوام
ایک آنسو بھی مقدر سے گہر بن نہ سکا
میں نے ہر چند ہواؤں میں بچھائے شہتیر
کوئی چپر کھٹ کوئی گوشہ کوئی گھر بن نہ سکا

جس نے دیکھی مری پرواز تمسخر سمجھا!
اپنے بھی مجھ پہ ہنسے جیسے کہ بیگانے بھی

میری اس بے پر و بالی کا تماشہ کرنے
اہلِ ادراک بھی آجاتے تھے، دیوانے بھی
اس کے یونان کے بت دیکھ کے سب بھول گئے
انہی اطراف میں ہیں میرے صنم خانے بھی

کتنے ہنگامے ہیں اس شہر میں سب جانتے ہیں
کتنے ہنگامے ہیں اس قصر میں کس کو معلوم
اس کے دربار کے پالے ہوئے بد شکل غلام
اس کی بے نام حسیناؤں کا حُسنِ محروم
اس کی راہوں میں سلگتے ہوئے عنبر کا دھواں
اس کی خدمت میں مذاہب کے طلسمانہ رسوم

لوگ سائے کی طرح چلتے ہیں کھو جاتے ہیں
قمقمے جلتے ہیں دو کان سجی رہتی ہے
برف جم جاتی ہے ہر راہ پہ لیکن جس میں
میری بچی کی لحد ہے وہ ندی بہتی ہے

اس کے نغموں میں جو آہنگ ہے اسکی بابت
میں نہیں کہتا مری نوحہ گری کہتی ہے

میں وہ کردار ہوں جس کو غمِ دل کے باوصف
لوگ کہتے ہیں کہ بے حس ہے، خراباتی ہے
سانس چلتی ہے تو لے لذتِ رفتارِ خرام
موت آتی ہے تو لے رختِ سفر آتی ہے
میرا جو کام ہے وہ نقص ہے اور نقصِ ضعیف
اس کی جو بات ہے وہ وصف ہے اور ذاتی ہے

میری سازش پہ تو راتوں نے گواہی دی ہے
اس کی سازش کو نسیمِ سحری سے پوچھو
کون دلوانہ تھا اور کون نہایت ہشیار
پوچھنے والوں کی افسانہ گری سے پوچھو
کون سے جرم میں برباد ہوا روز نکرانٹز!
میرے ہیرو کی فراستِ نظری سے پوچھو

! ادوست جو ہیملٹ کے ایما سے قتل ہوا

آج کی رات پھر اسٹیج پہ رونق ہوگی

"اولڈ وِک" شہرِ طلسمات نظر آئے گا

دیکھنے والوں کو ہر سازشِ خوں کے پیچھے

میر افتراک، مراہات نظر آئے گا

اور میں رسم و روایات کی ضد کے باوصف

ایک ہی جست کو سیماب کی سیرت دے کر

اپنی افسانوی ہیئت کو بدل ڈالوں گا

جب مری روح برافگندہ نقاب آئیگی

لوگ گھبرا کے چلے جائیں گے اور میں چپ چاپ

ان نئے زخموں کو ویرانے میں سہلا لوں گا

اولڈ وِک ۔ انگلستان کا قومی شیکسپیئرین تھیٹر

جدائی

رُوح کا ایک عمرانی تجربہ

نگارِ شام غم میں تجھ سے رخصت ہونے آیا ہوں
گلے مل لے کہ یوں ملنے کی نوبت پھر نہ آئے گی
سرِ راہے جو ہم دونوں کہیں مل بھی گئے تو کیا
یہ لمحے پھر نہ لوٹیں گے یہ ساعت پھر نہ آئے گی
کہ میں اب صرف ان گذرے ہوئے لمحوں کا سایہ ہوں

اسی بازار میں، بارہ برس ہونے کو آئے ہیں
کہ میں نے فاسٹس کی طرح اپنی رُوح بیچی تھی!
مسرّت کی مسلسل گردشِ یکساں سے اکتا کر
تجھے حاصل کیا تھا اور ہر صورت بھلا دی تھی
پرانے ساز و ساماں اب مجھے رونے کو آئے ہیں!

غضب کی تیرگی ہے راستہ دیکھا نہیں جاتا
ہوا کے شور میں دریا کی موجیں بڑھتی جاتی ہیں
زمیں سے اکھڑے جاتے ہیں درختوں کے قدم پیہم
چٹانیں روپ بدلے زیرِ لب کچھ پڑھتی جاتی ہیں
اب اپنی انگلیوں کا فاصلہ دیکھا نہیں جاتا
جرس کی نغمگی آوازِ ماتم ہوتی جاتی ہے
وہی معمول کے بت ہیں، وہی لمحوں کی ویرانی
ذرا سی دیر میں یہ دھڑکنیں بھی ڈوب جائیں گی
مری آنکھوں تک آ پہنچا ہے اب بہتا ہوا پانی
تری آواز ـــــ مدھم ـــــ اور مدھم ہوتی جاتی ہے

ایک سہرا

یاروشہیدِ رسمِ جفا ہم ہوئے کہ تم
اپنی سلامتی سے خفا ہم ہوئے کہ تم

ہم پر ہنسے گا جو بھی سنے گا یہ واردات
رُسوا سرِ سموم و صبا ہم ہوئے کہ تم

اس کے حریمِ عارض و لب کے سکوت میں
ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا ہم ہوئے کہ تم

مانا کہ وہ ہمارے مقدر سے دور ہے
اس کیلئے دعا ہی دعا ہم ہوئے کہ تم

مانا کہ ہم پہ اس کی محبّت حرام ہے
چُپ چاپ کُشتگانِ وفا ہم ہوئے کہ تم

ہم اس ہوا کو چوم رہے ہیں جہاں وہ تھی
بیعت کنانِ دستِ صبا ہم ہوئے کہ تم

مشرق کے ہر رواج کی قربان گاہ پر
ہمراہیانِ کُل شُہدا ہم ہوئے کہ تم
ہے اُسکے چشم و رُخ کی ضیا غیر کیلئے
ہاں اسکے چشم و رُخ کی حیا ہم ہوئے کہ تم
ان انکھڑیوں میں شرم کے ڈورے کہاں سے آئے
ان انگلیوں پہ رنگِ حنا ہم ہوئے کہ تم
نظروں سے دور جس کو بسانی ہیں بستیاں
اس کے غریبِ شہرِ سبا ہم ہوئے کہ تم
لکھا ہو جِل کے سارے ستاروں نے جسکا نام
اس کہکشاں پہ آبلہ پا ہم ہوئے کہ تم
جس کی خموشیوں میں حکایت کا لوچ تھا
اس کی حکایتوں کی بنا ہم ہوئے کہ تم
اس ایک دن میں کتنی ہی صدیاں گذر گئیں
اس ایک پل میں اپنی قضا ہم ہوئے کہ تم
اس عقل و فہم و عمر و فراست کے باوجود
ذہنِ رقیب و دستِ گدا ہم ہوئے کہ تم

وفا کیسی

آج وہ آخری تصویر جلا دی ہم نے

جس سے اس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی

جس سے بے نور خیالوں پہ چمک آتی تھی

کعبۂ رحمتِ اصنام تھا جو مدت سے

آج اس قصر کی زنجیر ہلا دی ہم نے

آگ، کاغذ کے چمکتے ہوئے سینے پہ بڑھی

خواب کی لہر میں بہتے ہوئے آئے ساحل

مسکراتے ہوئے ہونٹوں کا سلگتا ہوا کرب

سرسراتے ہوئے لمحوں کے دھڑکتے ہوئے دل

جگمگاتے ہوئے آویزوں کی مبہم فریاد

دشتِ غربت میں کسی حجلہ نشیں کا محمل

ایک دن روح کا ہر تار صدا دیتا تھا
کاش ہم بک کے کبھی اس جنسِ گراں کو پالیں
خود بھی کھو جائیں پر اس رمزِ نہاں کو پالیں
عقل اس حور کے چہرے کی لکیروں کو اگر
آ مٹاتی تھی تو دل اور بنا دیتا تھا

اور اب یاد کے اس آخری پیکر کا طلسم
قصۂ رفتہ بنا زیست کی مانوں سے ہوا
دور اک کھیت پہ بادل کا ذرا سا ٹکڑا
دھوپ کا ڈھیر ہوا دھوپ کے ہاتھوں سے ہوا
اس کا پیار اس کا بدن اس کا مہکتا ہوا روپ
آگ کی نذر ہوا اور انہی باتوں سے ہوا

ناچ اے لب و رخسار کے جلتے ہوئے حلقے
اس لمس کے تہذیب و تمدن سے لپٹ کر
اس شاہدۂ زیست کے اقرار سے کٹ کر

گا اے ابدی راگ سے مخمور جوانی
مرمر کی رگوں میں تپشِ جام اچھل جائے
پتھر کی قبا آنچ کے احساس سے جل جائے

جھوم اے دلِ دانا کہ وہ کل آکے رہے گی
جب ہم دلِ ناداں کا علم لے کے چلیں گے
سینے میں غضب لب پہ قسم لے کے چلیں گے

زہرہ کے حسیں جسم اپالو کے حسیں خواب
ہم روح کے تیشے تری تکذیب کریں گے
پیدل ہیں تو رفتار پہ تادیب کریں گے

اے عقل محبت کی سزا ہے کہ نہیں ہے
اے جسم ترا پیار روا ہے کہ نہیں ہے
اے پردۂ اسرار خدا ہے کہ نہیں ہے

(پیرس)

جرمنی

میں نے کب جنگ کی وحشت کے قصیدے لکھے
میں نے کب امن کے آہنگ سے انکار کیا
میں نے تو اپنے سرِ دامنِ دل کو اب تک
کبھی پھولوں، کبھی تاروں کا گنہگار کیا
اے مری روحِ طرب میں نے ہر عالم میں
جب کبھی تو آئی ترے پیار کا اقرار کیا

لیکن اس دیس کے آہنگِ گراں بار میں بھی
وہی نغمہ ہے جو تب تاب کی تقدیر میں ہے
میں نے زلفوں کے گھنے سائے میں سیکھی تھی جو بات
وہی اس حلقۂ بدنام کی زنجیر میں ہے
کتنے خوابوں کے طلسمات کی جنت ہے یہاں
کون سا خواب ابھی پردۂ تقدیر میں ہے

خواب اس وقت کا جو وقت نہیں آسکتا
خواب اس وقت کا جس وقت کو آنا ہوگا

گیت جس میں لب و رخسار کے افسانے ہیں
گیت جو خود بھی کبھی ایک فسانہ ہو گا!
جس کو چھیڑیں گے مہکتے ہوئے ہونٹوں کے گلاب
جس کو بندوق کے آہنگ پہ گانا ہو گا

آگ کے دشت پڑے، خُون کے صحرا آئے
اب بھی لیکن وہی رفتارِ جواں ہے کہ جو تھی
میونخ اب بھی ہر اک عہد کا روشن وارث
ہائیڈلبرگ وحکمت کی دوکاں ہے کہ جو تھی.

فرض کرتے ہیں تری مرگ وہی لوگ جنہیں
خود نہ جینے کا سلیقہ ہے نہ مرنے کا شعور!
تیرے ماتھے پہ نئے عہد نئے دن کی امنگ
تیری آنکھوں میں چمکتے ہوئے مہتاب کا نور
ویگنر کا یہ سبک ساز یہ فولاد کے گیت
تیرے سینے کی امنگیں ترے بازو کا غرور
ہم پیمبر تو نہیں ہیں ترے دیوانے ھیں
اک ذرا آگ ہمیں بھی ملے اے شعلۂ طور

(فرینکفرٹ)

ڈووَر

آوٗف وِیڈر ذہن، فرالائن، آوٗف وِیڈر ذہن،

مے خانے سے میلوں جگمگ جگمگ کرتی نہر
تیرے سینے کی طغیانی، میرے دل کی لہر
ریت کی دیواروں سے بنا تھا پیار کا پہلا شہر

نگر نگر کے خواب میں گم ہیں ڈووَر کے ملاح
میں ان خوابوں کے مبہم سناٹے سے آگاہ
اونچی لہریں، بڑھتا دریا، نیچی شہر پناہ

شاید اس طوفان میں ساری بنیادیں ہل جائیں
یا مشرق اور مغرب کے ساحل ایک دن مل جائیں
یہ مبہم مبہم سپنے کمہلائیں یا کھل جائیں

آوٗف وِیڈر ذہن، فرالائن، آوٗف وِیڈر ذہن!

آوٗف وِیڈر ذہن : خدا حافظ فرالائن : آنسہ

یونان

ہم تو یہ سوچ کے آئے تھے تری گلیوں میں
کہ یہاں تیشۂ فرہاد کی قیمت ہو گی!
بھائی کیوپڈ سے ملیں گے کسی دوراہے پر
کسی بے نام سے اک موڑ پہ جنت ہو گی
ہم اولمپس پہ خداؤں کی زباں بولیں گے
اپنی تقدیر میں وینس کی رفاقت ہو گی

باادب جا کے زئیس سے یہ کہیں گے کہ حضور
آپ اب خلوتِ گمنام سے باہر نکلیں
دیر سے تشنۂ صبحِ لب و رخسار ہیں لوگ
آپ تاریکیٔ احرام سے باہر نکلیں!

پارتھنان کی مٹی سے جو مَس ہو گی نظر
ہم نے سوچا تھا کہ کھل جائیں گے سارے اسرار
آج کل یوں نہیں ہوتا ہے مگر شاید آج!
ٹوٹ جائیں گے تمدّن کے مہذّب پندار

اور اب شام بھی گزری کئی دن بیت گئے
ایسے دن جن میں نہ ارماں نہ گلے ہوتے ہیں
میرا سینہ شبِ مفلس کا وہ افسانہ ہے!
جس پہ ایتھنز کے خاموش دیئے روتے ہیں
ایسی پستی کہ عمارت کا گماں بھی دھوکا
ہمانے ہم کور نظر ہیں کہ خدا سوتے ہیں
(ایکراپولس)

مصر

یہ زندگی، یہ مختصر سی زندگی

اگر یونہی علالتوں کے سلسلے میں کٹ گئی

اگر یہ بانسری نہ اوس پی سکی نہ چاندنی کے نرم گھاؤ سہہ سکی

اگر عروسِ شام کی رِدا نحیف انگلیوں میں تھرتھرا کے رہ گئی

تو میں کہاں تک اپنے حوصلے کے بل پہ اپنی زخم خوردہ کائنات کو سجاؤں گا

دریدہ پیرہن میں زرد زرد پھول باندھ کر

میں سُرخ کونپلوں کی انجمن میں کیسے جاؤنگا

سحر سوئز پہ ہوئی

تو جلتی آنکھ، تپتے جسم، خشک لب کے باوجود

سوئز اپنے ساحلوں کے درمیان ایسے بہہ رہی تھی جیسے کوئی اپنے حسن کا وقار جانتے ہوئے قدم اٹھائے

ادب سے اک قطار میں جہاز ایسے بڑھ رہے تھے جیسے کوئی بھکشوؤں کا قافلہ گپھا میں جائے

فرنگیوں کے چہرے یوں اُجڑ گئے تھے جیسے کوئی اک قدم کے فاصلے پہ موت سے نظر ملائے

انگلستان جاتے ہوئے جبرالٹر پورٹ پر شدید علالت میں لکھی گئی۔

نگارِ ارضِ نیل کے سنہرے جسم کے گداز سے لپٹ کے ایک ایک آرزو چمک گئی
نگارِ ارضِ نیل کی لٹیں کھلیں تو دور دور تک ہوا مہک گئی !

ہوا مہک گئی تو کیا
کہ میں ڈٹال اور اسپرٹ کا مہمان تھا
مرے تھکے ہوئے قدم
سفر کے پہلے سنگ میل سے لپٹ کے رہ گئے
مجھے کسی ملول، دل شکستہ یاد کی طرح
سلگتے آنسوؤں کی لوریوں میں نیند آ گئی
مگر حسینِ قاہرہ کی رات جاگتی رہی !
مہیب بت کے عاشقوں کو موت آ گئی تو کیا
مہیب بت کی عظمتِ حیات جاگتی رہی

دجبر الہٰ

کربلا

کربلا ، میں تو گنہگار ہوں لیکن وہ لوگ
جن کو حاصل ہے سعادت تری فرزندی کی
جسم سے روح سے احساس سے عاری کیوں ہیں
ان کی مسمار جبیں، ان کے شکستہ تیور !
گردشِ حسن شب و روز پہ بھاری کیوں ہے
تیری قبروں کے مجاور، تیرے منبر کے خطیب
فلس و دینار و تو جہہ کے بھکاری کیوں ہیں
روضۂ شاہِ شہیداں پہ اک انبوہِ عظیم
بل ایئر اور کرسلر کے نئے ماڈل کو !
اسی خاموش عقیدت سے تکا کرتا ہے
جس کو کہہ دوں تو کئی لوگ بُرا مانیں گے
غیر تو رمزِ غمِ کون و مکاں تک پہنچے
کربلا تیرے یہ غمخوار کہاں تک پہنچے

دل کو تہذیبِ تمنا میں خدا ملتا ہے

جنبشِ یک لبِ عیسےٰ میں خدا ملتا ہے

شورِ ناقوس و نظارا میں خدا ملتا ہے

سنگِ محرابِ کلیسا میں خدا ملتا ہے

تیرے دیوانوں کو اے شاہدِ دریائے فرات

اپنی بے مائگیِ ذہن میں کیا ملتا ہے

(کربلا)

ویلز کی گاڑی

دن بھر کے سورج کی ہمت ٹوٹ چکی تھی
ویلز کو جانے والی گاڑی چھوٹ چکی تھی
یہ احساس تھا جیسے دل آباد نہیں ہے
جانے کون سا اسٹیشن تھا یاد نہیں ہے
یوں بے رنگ تھے جیسے دشت میں گزریں سو سال
ہم ہونے کو کیسا نوحہ ہوں یا کچھ ہوں

کافی دیر میں پھر سہ پہر کی گاڑی آئی
ہم نے اپنا کوٹ سنبھالا فیلٹ اٹھائی
کاریڈر میں داخل ہوتے ہی لہرائے
جسم کو جیسے بھولے سے بجلی چھو جائے
وہ سنگیت تھی یا تارا تھی یا نرس تھی
ایسی شکل تو سارے لندن میں بھی نہیں تھی

دو گھنٹوں میں دوست بنے ہم پیار جتایا
یہ قصّہ تو خیر کسی فرصت پہ اٹھایا
لیکن اتنا یاد ہے جب سورج نے جگایا
وہ بھی نہیں تھی اپنا اسٹیشن بھی نہیں تھا
جانی، پہچانی چیزیں تھیں خاموشی تھی
ویلز کی گاڑی ویلز سے واپس آ پہنچی تھی

فن کے گاہک محو ہیں تکرار میں
ہم تماشائی ہیں اس بازار میں

تیرے خد و خال سے ملتی ہوئی
شکل تھی اک روح کے معیار میں

جھلملائیں پہلے پلکوں کے اُدھر
پھر وہ شمعیں جاگ اٹھیں رُخسار میں

فتح کے احساس میں گم تھا نیاز
آنسوؤں کی آنچ تھی پندار میں

سب نے اس کے حکم پر سجدے کئے
ہم اکیلے رہ گئے انکار میں

(۱۹۷۰ء)

نئی تلاش میں ہر رہنما سے باتیں کیں
خلا سے ربط بڑھایا ہوا سے باتیں کیں

کبھی ستاروں نے بھیجا ہمیں کوئی پیغام
تو مدتوں میں کسی آشنا سے باتیں کیں

ہماری خیر مناؤ کہ آج خود اس نے
بڑے خلوص، بڑی التجا سے باتیں کیں

گناہ گار تو رمز حریم تک پہنچے
ثواب والوں نے بانگ درا سے باتیں کیں

بہت سے وہ تھے جنہوں نے بتوں سے فیض اٹھائے
بہت سے وہ تھے جنہوں نے خدا سے باتیں کیں

نہ جانے کب سے سناتے تھے اس کو ہم احوال
نظر اٹھائی تو پھر ابتدا سے باتیں کیں

ہزار شعر کہے یوں تو کہنے والوں نے
کسی کسی نے دل مبتلا سے باتیں کیں

قدم قدم پہ تمنائے التفات تو دیکھ
زوالِ عشق میں سوداگروں کا ہات تو دیکھ

بس ایک ہم تھے جو تھوڑا سا سر اٹھا کے چلے
اسی روش پہ رقیبوں کے واقعات تو دیکھ

غمِ حیات میں حاضر ہوں لیکن ایک ذرا
نگارِ شہر سے میرے تعلقات تو دیکھ

خود اپنی آنچ میں جلتا ہے چاندنی کا بدن
کسی کے نرم خنک گیسوؤں کی رات تو دیکھ

عطا کیا دلِ مضطر تو سی دیئے میرے ہونٹ
خدائے کون و مکان کے توہمات تو دیکھ

گناہ میں کبھی بڑے معرفت کے موقعے ہیں
کبھی کبھی اسے بے خدشہ نجات تو دیکھ

غازی بنے رہے سبھی عالی بیان لوگ
پہنچے سرِ صلیب فقط بے نشان لوگ

اخلاقیاتِ عشق میں شامل ہے یہ نیاز
ہم ورنہ عادتاً ہیں بڑے خود گمان لوگ

چھوٹی سی اک شراب کی دوکان کی طرف
گھر سے چلے ہیں سُن کے عشا کی اذان لوگ

دل اک دیارِ رونق و رم ہے لُٹا ہوا
گذرے ہیں اس طرف سے کئی مہربان لوگ

اے دلِ انہی کے طرزِ تکلم سے ہوشیار
اس شہر میں ملیں گے کئی بے زبان لوگ

آیا تھا کوئی شام سے واپس نہیں گیا
مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں ہمارا مکان لوگ

ان سے جنہیں کنوئیں کے سوا کچھ خبر نہیں
مغرب کا طنز سنتے ہیں ہم نوجوان لوگ

یوں تو وہ ہر کسی سے ملتی ہے
ہم سے اپنی خوشی سے ملتی ہے

سیج مہکی بدن سے شرما کر
یہ ادا بھی اسی سے ملتی ہے

وہ ابھی پھول سے نہیں ملتی
جوہیئے کی کلی سے ملتی ہے

دن کو یہ رکھ رکھاؤ والی شکل
شب کو دیوانگی سے ملتی ہے

آج کل آپ کی خبر ہم کو!
غیر کی دوستی سے ملتی ہے

شیخ صاحب کو روز کی روٹی
رات بھر کی بدی سے ملتی ہے

آگے آگے جنون بھی ہو گا!
شعر میں لَو ابھی سے ملتی ہے

یہ گھٹا گھٹا طوفان، یہ تھمی تھمی بارش رُوبرُو نہ رہ جائے
آج اس طرح رولے جس کے بعد رونے کی آرزو نہ رہ جائے

دوستو گلے مل لو، ساتھیوں کی محفل میں دو گھڑی کو مل بیٹھو
اس خلوص کی شاید میرے بعد دنیا میں آبرو نہ رہ جائے

صبح و شام کی الجھن، رات دن کے ہنگامے روز روز کا جھگڑا
دیکھ پیرِ میخانہ آج میں نہ رہ جاؤں یا سبو نہ رہ جائے

اپنا غم نہ اس کا غم ڈوبتی ہوئی ناؤ کو فکر ہے تو اس کی ہے
دربدر نہ رسوا ہو حسرتوں کا افسانہ کو بہ کو نہ رہ جائے

(ن ہ)

فضائے شامِ غریباں طلوعِ صبحِ طرب
مری سرشت میں کیا کچھ نہیں بہم آمیز

شکستِ دل کے فسانے کا ایک باب ہے اشک
لہو نے جس میں کیا ہے ذرا سا نم آمیز

مجھے تو اپنی تباہی کا کوئی علم نہ تھا
مگر وہ آنکھ کبھی ہے آج کل کرم آمیز

کبھی جنونِ تمنا کبھی بے غرض بے لوث
کبھی خلوصِ رفاقت کبھی بیش و کم آمیز

مرے صنم میں بہت کچھ خدا کے تیور ہیں
یہ اور بات کہ تیرا خدا صنم آمیز

زندگی دھوپ ہے سناٹا ہے
نکہتِ عارض و کاکل والو!
رات آئے گی گذر جائے گی
عاشقو! صبر و تحمل والو!
ہم میں اور تم میں کوئی بات نہ تھی
مہ جبینوں میں تجاہل والو
اعتبارات کبھی اٹھ جائیں گے
اے غمِ دل کے تسلسل والو!
پھر بہاروں میں وہ آئیں کہ نہ آئیں
دوستو! زخمِ جگر دھلوا لو

آؤ کسی اداس ستارے کے پاس جائیں
دریائے آسماں کے شکارے کے پاس جائیں
اس سے کبھی پوچھ لیں کہ گذرتی ہے کس طرح
یارو کبھی کسی کے سہارے کے پاس جائیں
مٹھی میں لے کے دل میں بٹھا لیں جو ہو سکے
اک ناچتی کرن کے شرارے کے پاس جائیں
اس مہ جبیں کی یاد بھی باقی نہیں رہی
کس منہ سے چاندنی کے نظارے کے پاس جائیں
نا پختگانِ عشق عجب وسوسے میں ہیں
دیکھیں یہیں کہیں سے کہ دھارے کے پاس جائیں
اس کش مکش میں سارے ادیبوں کا ذہن ہے
دل کی طرف چلیں کہ ادارے کے پاس جائیں
یا جاکے چھپ رہیں کسی شیشے کے قصر میں
یا عصرِ انقلاب کے آرے کے پاس جائیں!

تمہیں کیا فکر کیا اندیشۂ جاں ہم جو بیٹھے ہیں !
کہاں جائیں گے دنیا بھر کے طوفاں ہم جو بیٹھے ہیں

سحر کے قافلو تم اپنی اپنی راہ پہ جاؤ
یہیں رہ جائے گی شامِ غریباں ہم جو بیٹھے ہیں !

دکانِ شاعری میں اک سے اک رمزِ نہاں بیچے
بکے گا اس کا دین اور اس کا ایماں ہم جو بیٹھے ہیں

گنہگار و عروجِ زُہد سے ناشاد مت ہونا !
بڑھے گا کاروبارِ جنسِ عصیاں ہم جو بیٹھے ہیں

کسے اس کی نگاہِ ناز اب کے منتخب کرے
بہت مصروف ہیں یارانِ یاراں ہم جو بیٹھے ہیں

میاں ہم سے سبق لو مصطفیٰ زیدی پہ مت جاؤ
تمہارے میکدے کے میرِ رنداں ہم جو بیٹھے ہیں

سحر جیتے گی یا شامِ غریباں دیکھتے رہنا

یہ سر جھکتے ہیں یا دیوارِ زنداں دیکھتے رہنا

ہر اک اہلِ لہو نے بازیِ ایماں لگا دی ہے

جو اب کی بار ہوگا وہ چراغاں دیکھتے رہنا

ادھر سے مدعی گزریں گے ایقانِ شریعت کے

نظر آجائے شاید کوئی انساں دیکھتے رہنا

اُسے تم لوگ کیا سمجھو گے جیسا ہم سمجھتے ہیں!

مگر پھر بھی کریں گے اس سے پیماں دیکھتے رہنا

سمجھ میں آ گیا تیری نگاہوں کے الجھنے پر!

بھری محفل میں سب کا ہم کو حیراں دیکھتے رہنا

ہزاروں مہرباں اس راستے پر ساتھ آئیں گے

میاں یہ دل ہے یہ جیب و گریباں دیکھتے رہنا

دبا رکھو یہ لہریں ایک دن آہستہ آہستہ

یہی بن جائیں گی تمہیدِ طوفاں دیکھتے رہنا

○

بہت بڑھنے لگے تھے دعویٔ دیر و حرم لوگو
غنیمت ہیں ہمارے شہر میں اس کے قدم لوگو!

کبھی دیکھا ہے اس صورت کا کوئی آدمی تم نے
بزرگو، ناصحو، عالی مقامو، محترم لوگو!

جسے کل تک حیا سے بات کرنا بھی نہ آتا تھا
ذرا ہم بھی تو دیکھیں اس کا اندازِ ستم لوگو!

گذرنے کو تو ہم پر تم سے نازک وقت گذرے ہیں
نہ اپنی شکل آزردہ، نہ اپنی آنکھ نم لوگو!

خلوصِ دوستداری نے ہمیں جو دن دکھائے ہیں
ہمیں ان کا خیال آتا ہے لیکن تم سے کم لوگو!

تمہاری انجمن میں بن گیا ہر منہ کا افسانہ
وہ اس کا خود سے شرماتا ہوا لطف و کرم لوگو

بہ قدرِ ظرف سب نے پیار کی قیمت لگائی ہے
کبھی آنسو، کبھی نغمہ، کبھی دام و درم لوگو

○

ہم سے پہلے کبھی یہ مرتبہ دار نہ تھا
عشق رسوا تھا مگر یوں سرِ بازار نہ تھا

آج تو خیر ستارے بھی ہیں ویرانے بھی
ہم پہ وہ رات بھی گذری ہے کہ غمخوار نہ تھا

کیا مری بات کو سمجھے کہ ابھی وہ کل تک
راہ و رسمِ دلِ ناداں سے خبردار نہ تھا

(ن ن ہڈ)

آگ لینے کے واسطے ہم سے
کوہِ طور آ کے ایک بار مِلا
تم کو دیکھا تو یہ ہوا محسوس
جیسے اک حادثے کا نار مِلا
دیکھے لاکھوں کسوٹیوں پہ نشان
تب کہیں جا کے اک سنار مِلا
ہم کو اس سے ملی رفاقت بھی
کم نصیبوں کو صرف پیار مِلا
لحظہ لحظہ بدلتی دنیا میں
ہم کو ہر نقش پائدار مِلا
دل وہ منعم ہے جس کو بن مانگے
ساری دنیا کا کاروبار مِلا
جو دیا تھا امیدِ منزلِ شب
شام ہی سے جگر فگار مِلا

کوئی رفیق بہم ہی نہ ہو تو کیا کیجے
کبھی کبھی ترا غم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

ہماری راہ جُدا ہے کہ ایسی راہوں پر
رواجِ نقشِ قدم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

ہمیں بھی بادہ گساری سے عار تھی لیکن!
شراب ظرف سے کم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

تباہ ہونے کا ارماں سہی محبت میں
کسی کو خوئے ستم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

ہمارے شعر میں روحیؔ کا ذکر بھی ہوگا
کسی کسی کے شکم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

(الکیانولنڈن)

زیدی جی پھر عشق کو نکلے اپنا سے بے پاپ
اِک بیوی کے شوہر ہیں اور اک بچے کے باپ

اسکی موہن شکل کو دیکھ کے ٹھان لیا بن باس
یوپی کے اِک سیّد زادے بن گئے تلسی داس

اپنے دل کی اوس میں جل کر آدھی رات کو سوئی
اک بدصورت لڑکی جس کی بات نہ پوچھے کوئی

اک لڑکی جس سے کوئی برسوں بات نہ کرنے آئے
اپنی ہمجولی کے چھبیلے بالم پر غرّائے

اک تو نیل گگن کی رانی سرخ کنول کے بیچ
دوجی اک برسات کا نالا جس میں کیچ ہی کیچ

صرف کہہ دُوں کہ ناؤ ڈوب گئی
یا بتادوں کہ کیسے ڈوبی تھی
تم کہانی تو خیر سُن لوگی
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

—

کوئی ساغر میں دیکھتا ہے فرار
کوئی جسموں میں ڈھونڈتا ہے سکوں
مجھ کو بھی مل گئی ہے جائے پناہ
شعر لکھتا ہوں اور جیتا ہوں

—

کیا خبر آج تیری آنکھوں میں
بڑھی ہے کہ غم سے رازونیاز
میرے سینے سے اب بھی آتی ہے
تیری پلکوں کی رحم دِل آواز

وقت کے ساتھ لوگ کہتے تھے

زخمِ دل بھی تمہارے ہوں گے دور
آج کوئی انہیں خبر کر دو
میرا ہر زخم بن گیا ناسور

—

میری آنکھوں میں نیند چبھتی ہے
میرے سینے میں جاگتے ہیں الاؤ
دیوتاؤ مری کہانی کو !
تم سمجھ لو تو آدمی بن جاؤ

—

مجھ کو چپ چاپ اس طرح مت دیکھ
میرے بستر کی سلوٹیں مت کھول
رات میں کتنی دیر سویا ہوں!
بول اے صبح کے ستارے بول

—

اس کے چہرے کا عکس پڑتا ہے
اس کی باتیں شروع ہوتی ہیں
آج کل رات بھر مرے دل میں
کتنی صبحیں طلوع ہوتی ہیں

—

کاش ہم لوگ لڑ گئے ہوتے
آپ کی دوستی کا رونا ہے
دل سے گردِ الم نہیں چھٹتی
آنسوؤں کی کمی کا رونا ہے

—

مدّتوں کورنگاہی دل کی
نُورِ عرفان کو ترستی رہتی
تو جو خورشید نہ بن کر آتی
ذہن پہ اوس برستی رہتی!

—

مثنوی سیاست درباں

یعنی مثنوی بنام ساحرانِ بیان المعروف بہ مثنوی زبدۃ درد بوانگی

نزول :-

ایک شعلے کو طور لکھتے تھے — آدمی ہو تو حور لکھتے تھے

شعر پرداز ہر زمانے کے — مثنوی بھی ضرور لکھتے تھے

پہلے عقبےٰ کی بات ہوتی تھی — حمد ہوتی تھی نعت ہوتی تھی

مُرغِ سدرہ کا بال ہوتا تھا — حال ہوتا تھا، قال ہوتا تھا

اور پھر داستانِ ہوش رُبا — دشتِ غربت، کجاوۂ لیلیٰ

داستانِ عجائبِ ایران — دیو و اژدر، فرشتہ و انسان

مدتوں شاہِ سلطنت کا شکیب — آئے دن کی مراد، دل کے فریب

جشنِ میلاد پر چھنک پازیب — بارھویں سال میں کوئی آسیب

دینا ترجیح نصف کو کل پر — شیر کا کسب کو نوکل پر !

ایک عبرت پسند افسانہ — کسی تاجر اور اسکی طوطی کا

دعوئے ہُدہُد کا، زاغ کا اعلان | عالمِ سنجو اور کشتی بان
حادثہ اک نہنگِ دریا کا | واقعہ بہزن و منیژہ کا

حمد:-

پہلے ہوتی ہیں حمد کی باتیں | ہم مگر کس کی حمد میں لکھیں؟
وہ کسی کا کہا نہیں سنتا! | مولوی کی دُعا نہیں سنتا
ہم تو عاصی ہیں ہم تو گندے ہیں | ان کو دیکھو جو اس کے بندے ہیں
انکی خلقت میں جس قدر ہیں نام | کس کو حاصل ہے آجکل الہام؟
اس لئے بہرِ یک سلام و پیام | آؤ ڈھونڈیں اساتذہ کا کلام
میر صاحب کے باغ میں گھومیں | میرزا کی بیاض کو چومیں
یا ابھی اتنی دور تک کیوں جائیں | کیوں نہ دستِ صبا سے کام چلائیں

نعت:-

اے صبا اے رفیقِ میر و حسن | ناشرِ واقعاتِ صحنِ چمن!
حاملِ نکہتِ لب و رخسار | قاصدِ حادثاتِ فصلِ بہار
پیکِ افسانہ ہائے مصر و عراق | غم گسارِ مریضِ شامِ فراق
اے کہ مشاطگی ہے تیرا اصول | اے شبستانِ ماورا کی رسول
اے کہ تجھ سے کوئی نہیں پنہاں | واقفِ رازِ خلوتِ انساں

لوگ رکھتے ہیں اس زمانے کے ۔۔۔ دانت کھانے کے اور دکھانے کے

عقل کی رہنمائی سے بدظن ۔۔۔ جہل کے دوست علم کے دشمن

دل کے کالے زبان کے کچے! ۔۔۔ سازشوں کے جنے ہوئے بچے

لے کے چلتا ہے وقت کا دھارا ۔۔۔ ان کی فرمائشوں کا پشتارا

ان کے دشمن کو ماریے لکھئے ۔۔۔ یہ نہیں تو بہاریے لکھئے

صاحبانِ کلاہ اچھے تھے ۔۔۔ ان سے تو بادشاہ اچھے تھے

طیش میں حکمِ قتل بھرتے تھے ۔۔۔ طعن و تشنیع تو نہ کرتے تھے

آج ہیں مثلِ سر بہ مہر گلاس ۔۔۔ سب خواص اور سب عوام الناس

عقل کی پوچھئے نہ جیسے سے ۔۔۔ یہ چھلکنے لگیں گے غصے سے

ان کی مرضی ہے جو کریں تلقین ۔۔۔ دین کو کفر اور کفر کو دین

رجعتِ غم پسند بھی گالی ۔۔۔ اور ترقی پسند بھی گالی!

اس کے درباں ہیں سو بھدکتے ہیں ۔۔۔ فن کی تہذیب سے بدکتے ہیں

جان دے یا عظیم کہلائے ۔۔۔ آدمی جائے تو کہاں جائے

رجز :-

حسنِ ظن تو نہیں اگر یہ کہوں ۔۔۔ میں بھی تھوڑا شعور رکھتا ہوں

خصلتاً چپ ہے تیرا جذباتی ۔۔۔ ورنہ کیا بات کر نہ

میری نظموں کا ہے ہر اک انداز
میرے پورے وجود کی آواز

اک خلا کی صدا نہیں ہوں میں
ہڈیاں بھی ہیں پھیپھڑے بھی ہیں

دلِ پُرخوں ہے میری اِک اِک رگ
شاعرانہ مبالغوں سے الگ

میرے لہجے میں ڈھونڈتی ہے وقار
اقتصادی خیال کی رفتار

میری باتوں میں احتساب بھی ہے
میری نظموں میں انقلاب بھی ہے

رجعت پسندی

ہاں مگر سوچتا ہوں میں اکثر
کیا یہ ہے آخری مقامِ نظر؟

یہ پُراسرار تشنگی کیا ہے
فرد کیا شے ہے زندگی کیا ہے

وہ سفر کے خیال کے مجنوں
میں تو مقصد کی بات کرتا ہوں

اور مرے اس سوال میں خود بیں
سارتر اور کیر کیگارڈ نہیں

یہ مرے تجربوں نے پوچھا ہے
آدمی کی حدوں نے پوچھا ہے

اپنے احساس سے پناہ نہیں
کافکا کا کوئی گناہ نہیں!

ذہن میں آگ ایسے سوتی ہے
جیسے روٹی کی بھوک ہوتی ہے

حدتِ مہرِ تابدار ہے ذہن
ایک میدانِ کارزار ہے ذہن

دل کی سب سے بڑی دلیل ہے ذہن
ابدیت کا سنگِ میل ہے ذہن

ذہن میں خواب بیج بوتے ہیں
ذہن کے اپنے شہر ہوتے ہیں

ذہن کو ہے خدا کی سی توفیق — ذہن کرتا ہے انجمن تخلیق

در ھجوِ عطّار :-

اے صبا ان سے یہ بھی کہنا ہے — دِل کے مکھڑے پہ ذہن گہنا ہے
تولتے ہیں جسے یہ اھلِ نظر — ادرک اور پھٹکری کے کانٹے پر
اک طرف ضبط اک طرف جلدی — اک طرف شعر اک طرف ہلدی
عقل سوداگروں کی ہلچل میں — فِکر مار اللحم کی بوتل میں
ماہرِ نفسیات واھلِ نظر — ہینگ ملتے ہیں اب کسوٹی پر
آنسوؤں سے عرق بناتے ہیں — دھوپ دے کر جنا جلاتے ہیں
پر و پرواز سایہ و کابوس — پھول کا نام جیّد الکیموس
دل میں اک پون انچ کی ہتّی — فن بہ یک وزن ماشہ و رتی!
شاعروں سے شکایتی باتیں! — ایسا لکھئے کہ ہم بھی کچھ سمجھیں
نامۂ شوق کا جواب آئے — شعر سے بوئے بیدِ آب آئے
بار گزرے نہ درسِ مکتب پر — نظم ہو لخلخے کے مذہب پر

منشور :-

یوں تو ہر فلسفہ عبادت ہے — یوں تو مذہب بھی اک محبّت ہے
ہاں مگر ان کے میرے مذہب میں — تفرقے کی ہیں سینکڑوں باتیں

جب کبھی ان کی ھار ہوتی ہے — زندگی کھبرپہ بار ہوتی ہے
ایک لمحے میں پھینکتا ہے خون — ان کے پورے وجود کا قانون
گھورتی ہیں پھٹی پھٹی آنکھیں — اپنے احساس کی اکائی میں
اور کچھ بھی نظر نہیں آتا — ایک ٹوٹی ہوئی کمان کے سوا
میرا مذہب خود اپنا مذہب ہے — عشق ہے کائنات ہے سب ہے
یہ نہیں ہے کہ اس کی دنیا سے — غم کے بادل کبھی نہیں گزرے
زیست میلہ نہیں ہے ہنستوں کا — تجربہ ہے اسے شکستوں کا
بارہا میرے اپنے سینے میں — کٹ چکی ہیں ہزارہا گرہیں
غم کہ ہے اک خیال اک افسوں — میں اسے انگلیوں سے چھوتا ہوں
یہی نشتر جو کاٹ دے رگ وپے — میری نس نس میں ہوتا آیا ہے
میں نے لیکن لہو کے دامن میں — ڈال دی ہیں خیال کی کرنیں
رات لے کر سحر سجائی ہے — زخم پر ہنس کے جیت پائی ہے
چھین کر آنسوؤں سے موت کی آگ — ہر تبسم کو دے دیا ہے سہاگ
دل گنوایا ہے تیر کھایا ہے — عشق کو جاوداں بنایا ہے
ایک منزل شعور اور وجدان — ذہن اور دل کی ایک ہی میزان
اور یہ صاحبانِ سوزِ دروں — عشق کو دل میں مانتے ہیں جنوں

اور ایسا جنوں کہ جس کا مکاں — یا کتابیں ہیں یا فقط غزیاں
عشق ہے ان کی ایک رسمی لے — اور اپنا تو سارا نغمہ ہے
نام ہے اپنا سب حوالوں میں — بات کی لاج رکھنے والوں میں
زخم تلووں میں چند رکھتے ہیں — ہم مگر سر بلند رکھتے ہیں
دل ڈراتی ہے کھینچتی ہے کماں — دو گھڑی کی سیاستِ درباں
ہم کو لیکن لگن بھی آتی ہے — یار کی انجمن بھی آتی ہے
ہر زمانے میں ہم پہ حرف آئے — ہم نہ اپنے کیے پہ پچھتائے
اہلِ دنیا تو ایک ہوتے ہیں — لوگ بے چارے نیک ہوتے ہیں
حرف رکھنا انہی کو بھاتا ہے — ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے
جس جگہ یہ کنول جلاتے ہیں — ہم وہاں کونپلیں اگاتے ہیں
ان کو بھاتی ہیں سنگ کی لہریں — اپنے تیشے کو دودھ کی نہریں
راستے سخت منزلیں بے نام ! — دل نہیں ہارتے جنوں کے امام
زیست سہہ لے گی رات کا ہر وار — جگمگائیں گے چاند سے رخسار
آنچ پڑتی رہے گی ہر فن پر ! — تاب آتی رہے گی کندن پر
خوں پیئے گی زمین گلشن کی ! — ساکھ بڑھتی رہے گی ساون کی

جشنِ بادِ صبا نہیں رُکتا
پھول کا قافلہ نہیں رُکتا
جب کبھی پھول سوکھ جاتے ہیں
اور آتے ہیں ــــ اور آتے ہیں

مُصطفیٰ زیدی

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی) ۔ لیک روڈ۔ لاہور

اُن نے کھینچا ہے مرے ہات سے داماں اپنا
کیا کروں گر نہ کروں چاک گریباں اپنا

میرؔ

——بزم میں باعثِ تاخیر ہُوا کرتے تھے

——ہر اک نے کہا: کیوں تجھے آرام نہ آیا

——چلیے، تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ

——جب ہوا شب کو بدلتی ہُوئی پہلو آئی

——وُہ عہد عہد ہی کیا ہے، جسے نبھاؤ بھی

——ساحلِ ٹیمز پہ سنگم کا صنم یاد رہا

——غمِ دوراں نے بھی سیکھے غمِ یاراں کے چلن

——شیریں زبانیوں کے دریچے اُجڑ گئے

——تیرے چہرے کی طرح اور مرے سینے کی طرح

——بیٹھا ہُوں سیہ بخت و مکدّر اسی گھر میں

——حرف ہے شیشہ، ہونٹ ہیں ساغر، لفظ ہے جام

——اب جی حُدُودِ سود و زیاں سے گزر گیا

○

بزم میں باعثِ تاخیر ہُوا کرتے تھے
ہم کبھی تیرے عناں گیر ہُوا کرتے تھے

ہائے اب بھُول گیا رنگِ حنا بھی تیرا
خط کبھی خوُن سے تحریر ہُوا کرتے تھے

کوئی تو بھید ہے اِس طَور کی خاموشی میں
ورنہ ہم حاصلِ تقریر ہُوا کرتے تھے

ہجر کا لُطف بھی باقی نہیں، اے موسمِ عقل
اِن دنوں نالۂ شبگیر ہُوا کرتے تھے

اِن دنوں دشت نوردی میں مزا آتا تھا
پاؤں میں حلقۂ زنجیر ہُوا کرتے تھے

خواب میں تجھ سے ملاقات رہا کرتی تھی
خواب شرمندۂ تعبیر ہُوا کرتے تھے

تیرے الطاف و عنایت کی نہ تھی حد، ورنہ
ہم تو تقصیر ہی تقصیر ہُوا کرتے تھے

○

ہر اک نے کہا: کیوں تجھے آرام نہ آیا
سُنتے رہے ہم، لب پہ ترا نام نہ آیا

دیوانے کو تکتی ہیں ترے شہر کی گلیاں
نِکلا، تو اِدھر لَوٹ کے بدنام نہ آیا

مت پُوچھ کہ ہم ضبط کی کِس راہ سے گُزرے
یہ دیکھ کہ تجُھ پر کوئی اِلزام نہ آیا

کیا جانیئے کیا بِیت گئی دِن کے سفر میں
وُہ مُنتظِرِ شام سرِ شام نہ آیا

یہ تِشنگیاں کل بھی تھیں اور آج بھی، زیدی
اُس ہونٹ کا سایہ بھی مرے کام نہ آیا

○

چلے، تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ
ہم اُس کے پاس جاتے ہیں، مگر آہستہ آہستہ

ابھی تاروں سے کھیلو، چاند کی کرنوں سے اٹھلاؤ
ملے گی اُس کے چہرے کی سحر آہستہ آہستہ

دریچوں کو تو دیکھو، چلمنوں کے راز تو سمجھو
اُٹھیں گے پردہ ہائے بام و در آہستہ آہستہ

زمانے بھر کی کیفیت سمٹ آئے گی ساغر میں
پیو اُن انکھڑیوں کے نام پر آہستہ آہستہ

یونہی اِک روز اپنے دِل کا قصّہ بھی سُنا دینا
خطاب آہستہ آہستہ، نظر آہستہ آہستہ

○

جب ہوا شب کو بدلتی ہوئی پہلو آئی
مدتوں اپنے بدن سے تری خوشبو آئی

میرے مکتوب کی تقدیر کہ اشکوں سے دھلا
میری آواز کی قسمت کہ تجھے چھو آئی

اپنے سینے پہ لیئے پھرتی ہیں ہر شخص کا بوجھ
اب تو ان راہگزاروں میں مری خو آئی

یوں امڈ آئی کوئی یاد مری آنکھوں میں
چاندنی جیسے نہانے کو لبِ جو آئی

ہاں، نمازوں کا اثر دیکھ لیا پچھلی رات
میں ادھر گھر سے گیا تھا کہ ادھر تو آئی

مژدہ، اے دل، کہ کسی پہلو تو قرار آ ہی گیا
منزلِ دار کٹی، ساعتِ گیسو آئی

○

وُہ عہد عہد ہی کیا ہے جسے نبھاؤ بھی
ہمارے وعدۂ اُلفت کو بھُول جاؤ بھی

بھلا، کہاں کے ہم ایسے گمان والے ہیں
ہزار بار ہم آئیں، ہمیں بُلاؤ بھی

بگڑ چلا ہے بُہت رسمِ خُود کشی کا چلن
ڈرانے والو، کِسی روز کر دِکھاؤ بھی

نہیں کہ عرضِ تمنّا پہ مان ہی جاؤ
ہمیں اِس عہدِ تمنّا میں آزماؤ بھی

فغاں کہ قصّۂ دِل سُن کے لوگ کہتے ہیں
یہ کون سی نئی اُفتاد ہے، ہٹاؤ بھی

تمہاری نیند میں ڈُوبی ہُوئی نظر کی قسم
ہمیں یہ ضِد ہے کہ جاگو بھی اور جگاؤ بھی

ساحلِ ٹیمز پہ سنگم کا صنم یاد رہا
ہم کو لندن میں ترا دیدۂ نم یاد رہا

پڑ گئے ذہن میں مدھم ترے چہرے کے نقوش
صرف اک شعلۂ جوّالہ کا رم یاد رہا

ٹوٹتے جسم کی سب تشنگیاں محو ہوئیں
مسکراتے ہوئے ہونٹوں کا کرم یاد رہا

تنگیٔ ساعتِ آغوشِ جنوں بھول گئی
ایک سہما ہوا آہوئے حرم یاد رہا

اب نہ گزرا ہے، نہ گزرے گا کوئی دیوانہ
خاکِ صحرا کو بس اک نقشِ قدم یاد رہا

ہم ہیں، دو چار ادیب اور بھی بچ گئے، زیدی
جن کو تلوار کے سائے میں قلم یاد رہا

○

غمِ دوراں نے بھی سیکھے غمِ یاراں کے چلن
وہی سوچی ہوئی چالیں، وہی بے ساختہ پن

وہی اقرار میں انکار کے لاکھوں پہلو
وہی ہونٹوں پہ تبسّم، وہی ابرو پہ شکن

کس کو دیکھا ہے کہ پندارِ نظر کے با وصف
ایک لمحے کے لیے رُک گئی دِل کی دھڑکن

کون سی فصل میں اس بار ملے ہیں تجھ سے
کہ نہ اندیشۂ آداب، نہ فکرِ دامن

اب تو چُبھتی ہے ہوا برف کے میدانوں کی
اُن دنوں جسم کے احساس سے جلتا تھا بدن

ایسی سُونی تو کبھی شامِ غریباں بھی نہ تھی
دِل بُجھے جاتے ہیں، اے تیرگیٔ صُبحِ وطن!

○

شیریں زبانیوں کے دریچے اُجڑ گئے
وہ لطفِ حرف و لذّتِ حُسنِ بیاں کہاں

پیچھے گزُر گئی ہے ستاروں کی روشنی
یارو، بسا رہے ہو نئی بستیاں کہاں

اے منزلِ ابد کے چراغو، جواب دو
آگے اب اور ہوگا مرا کارواں کہاں

ہر شکل پر فرشتہ رُخی کا گمان تھا
اُس عالمِ جنوں کی نظر بندیاں کہاں

بن جائے گی علامتِ نُصرت بدن کی قید
زنداں سے چھُپ سکے گی مری داستاں کہاں

○

تیرے چہرے کی طرح اور مرے سینے کی طرح
میرا ہر شعر دمکتا ہے نگینے کی طرح

پھول جاگے ہیں کہیں تیرے بدن کی مانند
اوس مہکی ہے کہیں تیرے پسینے کی طرح

اے مجھے چھوڑ کے طوفان میں جانے والی
دوست ہوتا ہے تلاطم میں سفینے کی طرح

اے مرے غم کو زمانے سے بتانے والی
میں ترا راز چھپاتا ہوں دفینے کی طرح

تیرا وعدہ تھا کہ اس ماہ ضرور آئے گی
اب تو ہر روز گزرتا ہے مہینے کی طرح

○

بیٹھا ہُوں سیہ بخت و مُکدّر اِسی گھر میں
اُترا تھا مرا ماہِ منوّر اِسی گھر میں

اُس سانس کی خُوشبُو، لبِ عارض کے پسینے
کھولا تھا مرے دوست نے بستر اِسی گھر میں

چٹکی تھیں اسی کُنج میں اُس ہونٹ کی کلیاں
مہکے تھے وُہ اوقات میسّر اِسی گھر میں

افسانہ در افسانہ تھی مُڑتی ہُوئی سیڑھی
اشعار در اشعار تھا ہر در اِسی گھر میں

ہوتی تھی حریفانہ بھی ہر بات پہ اِک بات
رہتی تھی رقیبانہ بھی اکثر اِسی گھر میں

شرمندہ ہُوا تھا یہیں پندارِ امارت
جھکا تھا فقیروں کا مقدر اِسی گھر میں

وُہ، جن کے درِ ناز پہ جُھکتا تھا زمانہ
آتے تھے بڑی دُور سے چل کر اِسی گھر میں

○

حرف ہے شیشہ، ہونٹ ہیں ساغر، لفظ ہے جام
تیرا نام زبان پہ آیا تیرا نام

شیخ سے کم رُتبہ ہے مے خانے کا امام
مسلکِ دُنیا یہ ہے، تو اس مسلک کو سلام

دُنیاداری نے دیں دار بنا ڈالا
اس سے تو یہ اچھا تھا کہ ہو جاتے بدنام

آنے والے دن کا استقبال کرو
گزری شام سے کیا لینا ہے، گزری شام

تم نے نصیری اور کہیں پہ سُنی ہو گی
اس نگری میں یا سنّاٹا یا کہرام

شہرِ وفا خالی کر جائیں، اے دلِ زار
سب مر جائیں، رگھپتی راگھو راجا رام

○

اب جی حُدُودِ سُود و زیاں سے گزُر گیا
اچھا وہی رہا، جو جوانی میں مر گیا

پلکوں پہ آکے رُک سی گئی تھی ہر ایک موج
کل رو لیئے، تو آنکھ سے دریا اُتر گیا

تجُھ سے تو دل کے پاس مُلاقات ہو گئی
میں خُود کو ڈھونڈنے کیلئے در بہ در گیا

شامِ وطن کچُھ اپنے شہیدوں کا ذِکر کر
جن کے لہُو سے صُبح کا چہرہ نِکھر گیا

آ کر، بہار کو تو جو کرنا تھا، کر گئی
الزامِ احتیاطِ گریباں کے سر گیا

زنجیر مانگتی ہے، تم، اے عاقلانِ شہر
اب کِس کو پُوچھتے ہو، دِوانہ تو مر گیا

۲

وہ اک ستارہ کسی اور آسمان کا تھا

اُفتاد

اے آتشِ تبسم و اے شبنمِ جمال
خاموش آنسوؤں کی طرح جل رہے ہیں ہم

تجھ کو خبر نہ ہو گی کہ دانش کے باوجود
برسوں ترے خیال میں پاگل رہے ہیں ہم

ہر بزمِ رنگ و رقص میں شرکت کے ساتھ ساتھ
تنہا رہے ہیں اور سرِ مقتل رہے ہیں ہم

دیکھا ہے تُو نے ہم کو بہاراں کے رُوپ میں
مجروح قافلے کی طرح چل رہے ہیں ہم

سب سے عزیز دوست کی خوشیوں کی راز دار
زخموں کی داستانِ مفصّل رہے ہیں ہم

سب سے بڑے گناہ کی حسرت کے رُو بہ رُو
تیرے لیے خلوصِ مسلسل رہے ہیں ہم

سفر کو نکلے تھے ہم جس کی رہ نمائی پر

سفر کو نکلے تھے ہم جس کی رہ نمائی پر
وُہ اِک سِتارہ کسی اور آسمان کا تھا

جسے ہم اپنی رگِ جاں بنائے بیٹھے تھے
وُہ دوست تھا، مگر اِک اور مہربان کا تھا

عجیب دِن تھے کہ با وصفِ دُوریٔ ساغر
گمان نشّے کا تھا اور نشہ گمان کا تھا

بس ایک صُورتِ اخلاق تھی نگاہِ کرم
بس ایک طرزِ تکلّم مزا بیان کا تھا

اس اہتمام سے وابستگی نہ تھی منظور
یہ اہتمام فقط دل کے امتحان کا تھا

ہوا نے چاک کیا، بارشوں نے دھو ڈالا
بس ایک حرف محبت کی داستان کا تھا

اے مری حسنِ قبا، اے مری جانِ ناموس

اَے مری حُسنِ قبا ، اے مری جانِ ناموس
میرے اُس چاکِ گریباں کی خبر بھی لیتی

شہر کے نُور کو سینے سے لگانے والی
رُوح کے قریۂ ویراں کی خبر بھی لیتی

جس کو اب تک نہیں یُوں تجھ سے بچھڑنے کا یقیں
کبھی اُس دیدۂ حیراں کی خبر بھی لیتی

اپنے ہاتھوں سے جلائی تھی جو میرے دل میں
اپنی اُس شمعِ فروزاں کی خبر بھی لیتی

جس نے اللہ کو بارہا ترے کہنے سے
کبھی اس شخص کے ایماں کی خبر بھی لیتی

تیرے آنچل میں ستارے، ترے چہرے پہ سحر
کاش اک شامِ غریباں کی خبر بھی لیتی

تیری تصویر سے روشن ہے قفس کا گوشہ
میری آرائشِ زنداں کی خبر بھی لیتی

تیرے مکتوب کی پلکوں پہ ہیں اب تک آنسو
کبھی اِس جشنِ چراغاں کی خبر بھی لیتی

تیرا رومال مہکتا ہے ابھی تک مرے پاس
نکہتِ جسمِ غزالاں کی خبر بھی لیتی

اپنے شوہر کے شبستاں کو سجانے والی
اپنے شاعر کے بیاباں کی خبر بھی لیتی

بُہتان

کیا یہی ہونٹ ہیں، جو مرے واسطے
انگبیں تھے، مئے ناب تھے، آگ تھے

کیا یہی جسم ہے، جس کے سب زاویئے
میرے آغوش میں راگ ہی راگ تھے

ہاں بڑی چیز ہے راہ و رسمِ جہاں
دوست، خاوند، بہنیں، قفس، پاسباں

ننگ و ناموس ——— سینے کی چنگاریاں
وُہ ترا امتحاں ——— یہ مرا امتحاں

رکھ لیا اپنے رشتوں کا تُو نے بھرم
آبگینہ تھا دِل، اس کو بھی سہہ گیا

تو مجھے "بھائی" کہتی رہی اور میں
کیا بتاؤں، تجھے دیکھتا رہ گیا

دُوری

پہلے تیری مُحبّتیں چُن کر
آرزُو کے محل سجاتے تھے

بے نیازانہ زیست کرتے تھے
صِرف تجُھ کو گلے لگاتے تھے

زندگی کی متاعِ سوزاں کو
تیری آواز لُوٹ جاتی تھی

تیرے ہونٹوں کی لَے اُبھرتے ہی
زخم کی تان ٹُوٹ جاتی تھی

تو کنول تھی، ایاغ تھی، کیا تھی
روشنی کا سُراغ تھی، کیا تھی

میرا دِل تھی، دماغ تھی، کیا تھی
ساری دُنیا چراغ تھی، کیا تھی

اور اب، یا شراب پیتے ہیں
یا، فلک کو دعائیں دیتے ہیں

تیرے خاوند کی معیت میں
دُور سے تجھ کو دیکھ لیتے ہیں

دیوار

تیرے کمرے کی یہ دیوار تو کچھ چیز نہیں
دِل کے آگے سے یہ دیوار ہٹے تو جانیں

دِل کی دیوار سے بڑھ کر کوئی دیوار نہیں
ذہن کی دھار سی جیسی کوئی تلوار نہیں
اپنے پندار سے آگے کوئی پندار نہیں

بیچ سے اپنا یہ پندار ہٹے، تو جانیں

تو اُدھر اپنے خیالات میں جلتی ہو گی!
میں اِدھر اپنی جراحت میں پھنکا جاتا ہوں

اِس جراحت کے لئے کوئی مسیحا بھی نہیں
تیرا آنچل بھی نہیں ہے، تیرا سایا بھی نہیں
اِس میں ماضی تو کہاں وعدۂ فردا بھی نہیں

دوش و فردا کا یہ انبار ہٹے، تو جانیں

ہٹ چکے ہیں ترے ہونٹوں سے نہ ملنے کے حجاب
اب تری رُوح کا انکار ہٹے، تو جانیں

چراغاں

تری راہ پر ہم نے کلیاں بکھیری تھیں، تارے
سجائے تھے، کیا کچھ کیا تھا
جو برسوں سے چاک و دریدہ چلا آ رہا تھا، وُہ
اپنا گریباں سِیا تھا
نئے پھُول مالی سے منگوائے تھے، بام و در پر نیا
رنگ و روغن کیا تھا
کِتابیں سلیقے سے رکھ دی تھیں، بوتل ہٹا دی
تھی گھر میں چراغاں کیا تھا
اگر عِلم ہوتا کہ تُو آج کی شب نہ آئے گی، تو
حسبِ معمُول رہتے
ترے غم کی مدھم سی آتش میں جلتے، مگر تجھُ
سے دِل کی حکایت نہ کہتے

نہ کہتے کہ اب ایک اک رگ سے، اک ایک
موئے بدن سے دھواں اٹھ رہا ہے
جو ٹھیرا تھا اپنی خودی کی سرائے میں، وہ ضبط
کا کارواں اٹھ رہا ہے

تجھے آج تک خط نہ لکھا تھا اور آج بھی یہ نہ
لکھتے کہ ہم مر رہے ہیں
نگاہوں سے سب کچھ بتاتے، اشارے سے کہتے کہ
دل کو لہو کر رہے ہیں

مگر تیری غفلت نے (شاید ترے شیوۂ امتحاں نے)
یہ منزل دکھا دی
کہ تھم تھم کے آنسو نکلتے تھے پہلے، مگر آج تو
دل کی ندی چڑھا دی

اُٹھے تھے کہ جشنِ چراغاں منائیں، مگر دِل کے
سارے دیئے سو گئے ہیں
چلے تھے کہ دُنیا کو رستہ دکھائیں اور اب
جیسے جنگل میں خُود کھو گئے ہیں،

ننگ و نام

صُبح تک آتی ہے سینے سے کسی کی آواز
ہائے، یہ سِلسلۂ شامِ غریباں، زیدی

تُو مرے واسطے کیوں موردِ الزام ہُوا
تُو نے کیوں ترک کیا رشتۂ یاراں، زیدی

اب نہ وُہ کوچہ و بازار میں آنا جانا
اب نہ وُہ صُحبتِ اصحابُ ادیباں، زیدی

اب ترے غم پہ زمانے کو ہنسی آتی ہے
پُھول جلتا ہے، تو کِھلتا ہے گُلستاں، زیدی

تیرے نزدیک سے کتراکے نِکل جاتے ہیں
تیرے اَیوانِ لب و فکر کے درباں، زیدی

لشکر و افسر و اَورنگ مِٹا کر تُو نے
وضع کی صُورتِ مستورِ فقیراں، زیدی

آج اِک گوشۂ گُمنام میں اُفتادہ ہے
کل ترے نام سے تھا نامِ نگاراں، زیدی

تیرے وِجدان کا خُورشید کہاں ڈُوب گیا
کیا ہُوا فلسفۂ عِصمتِ عصیاں، زیدی

ہائے تُو راکھ کی مانند بُجھا بیٹھا ہے
شعلہ رُخ، شعلہ صِفت، شعلہ خراماں، زیدی

ہیں ترے نام کی لَو، ہیں ترا روشن آغوش
میرے رُسوا، مرے حیراں، مرے ویراں، زیدی

میں نے یوں اپنے سلاسل کی نہیں کی پروا
ٹوٹ جائے نہ کہیں سلسلۂ جاں، زیدی

اس لیئے آئی ہوں ناموس سے غافل ہو کر
تو نہ ہو جائے کہیں چاک گریباں، زیدی

رشتہ و رسم کو اس واسطے ٹھکرایا ہے
تو نہ رہ جائے کہیں بے سر و ساماں، زیدی

کیسے سینے کی اِس آواز کو سمجھاؤں میں
میرے سینے میں مزامیرِ نہ الحاں، زیدی

وہ مجسم کوئی آیت، کوئی نورِ افلاک
میں پراگندہ نہ ملحِد، نہ مسلماں، زیدی

میں کہ محصور ہوں افکار کی دیواروں میں
وہ کہاں اور کہاں وحشتِ زنداں، زیدی

آگ کے سامنے جس طرح کوئی موم کا بُت
دھُوپ میں جیسے طلسمات کی پریاں، زیدی

ایک ننھّی سی کِرن اور اُمڈتے بادل
ایک چھوٹی سی کلی اور بیاباں، زیدی

میں تو بس ایک دِیا تھا، سو کہیں جَل بُجھتا
اُس نے کیوں چھوڑ دیا جشنِ چراغاں؟ زیدی

تحفہ

مُغاں سے لُطفِ ملاقات لے کے آیا ہُوں
نگاہِ پیرِ خرابات لے کے آیا ہُوں

زمیں کے کرب میں شامل ہُوا ہُوں، راہ رو
فقیرِ راہ کی سوغات لے کے آیا ہُوں

نظر میں عصرِ جواں کی بغاوتوں کا غرور
جگر میں سوزِ روایات لے کے آیا ہُوں

یہ فکر ہے کہ یُونہی تیری روشنی چمکے
گناہ گار ہُوں، ظلمات لے کے آیا ہُوں

بُہت سے آتے ہیں تیری گلی میں، لیکن میں
سوالِ عزّتِ سادات لے کے آیا ہُوں

کہانی

بچّو، ہم پر ہنسنے والو، آؤ، تمھیں سمجھائیں
جس کے لیئے اس حال کو پہنچے، اس کا نام بتائیں

رُوپ نگر کی اک رانی تھی، اس سے ہُوا لگاؤ
بچّو، اس رانی کی کہانی سُن لو اور سو جاؤ

اُس پر مرنا، آہیں بھرنا، رونا، کُڑھنا، جلنا
آب و ہوا پر زندہ رہنا، انگاروں پر چلنا

ہم جنگل جنگل پھرتے تھے اس کے لیئے دیوانے
رشی بنے، مجنوں کہلائے، لیکن ہار نہ مانے

برسوں کیا کیا چنے چبائے، کیا کیا پاپڑ بیلے
لہروں کو ہمراز بنایا، طوفانوں سے کھیلے

دفتر بھولے، بستر بھولے، پینے لگے شراب
پل بھر آنکھ لگے، تو آئیں لُٹے سیدھے خواب

نیندیں کیا کیا دیکھیں، تڑپیں، روئیں، اُٹھ اُٹھ جائیں
سو جانے کی گولی کھائیں، اِنجکشن لگوائیں

آخر وہ اک خواب میں آئی سُن کے ہمارا حال
کویل جیسی بات تھی اُس کی، ہرنی جیسی چال

کہنے لگی: کوئی جی، تیرا حال نہ دیکھا جائے
میں نے کہا کہ رانی اپنی پرجا کو بہلائے

کہنے لگی کہ تو کیا لے گا: سونا، چاندی، ہار
میں نے کہا کہ رانی، تیرے مکھڑے کی تلوار

پھر دِل کے آنگن میں اُترا اس کا سارا رُوپ
اُس چہرے کی شیتل کرنیں، اس مُکھڑے کی دھوپ

دھوپ پڑی، تو کھل گئی آنکھیں کُھل گیا سارا بھید
غش کھایا، تو دوڑے آئے مُنشی، پنڈت، وید

وُہ دِن ہے اور آج کا دِن ہے چھُٹ گیا کھانا پانی
چھُٹ گیا کھانا پانی، بچّو، ہو گئی ختم کہانی

میری کہانی میں لیکن اک بھید ہے، اس کو پاؤ
چاند کو دُور ہی دُور سے دیکھو، چاند کے پاس نہ جاؤ

نہ اپنے گھر ہی اُس کو بُلاؤ

مُحبّتؔ

تو مری شمعِ دل و دیدہ، مری معصومہ
پیار کی دُھوپ میں نکلی، تو پگھل جائیگی

کھولتا، گونجتا لاوا ہے مرے جسم کا لمس
تو مرے ہونٹوں کو چھو لے گی، تو جل جائے گی

تتلیاں چُن، ابھی خاروں کی طلب گار نہ بن
اپنے بالوں کو سجا، ماتمِ افکار نہ بن!

ناچ سنگیت پہ، طُوفان کی رفتار نہ بن
لوریاں سیکھ، مرے درد میں غم خوار نہ بن

میرا دِل وقت کے طُوفان میں ہے ایسی چٹان
اس سے شیشہ جو لگے گا، تو بکھِر جائے گا

اَبدی نیند کا پیغام ہے میرا آغوش
جو مری گود میں آئے گا، وُہ مر جائے گا

تو مری شمعِ دل و دیدہ

وُہ کوئی رقص کا انداز ہو، یا گیت کا بول
میرے دِل میں تری آواز اُبھر آتی ہے

تیرے ہی بال بکھر جاتے ہیں دیواروں پر
تیری ہی شکل کِتابوں میں نظر آتی ہے

شہر ہے یا کِسی عیّار کا پُر ہَول طِلسم
تو ہے یا شہرِ طِلسمات کی ننھّی سی پَری

ہر طرف سیلِ رواں، بس کا دُھواں، ریل کا شور
ہر طرف تیرا خنک گام، تری جلوہ گری

ایک اک رگ تری آہٹ کیلئے چشم بہ راہ
جیسے تُو آئے گی، بس کوئی گھڑی جاتی ہے

تیری پرچھائیں ہے یا تُو ہے مرے کمرے میں
بلب کی تیز چمک ماند پڑی جاتی ہے

ٹینک سڑکوں پہ چلیں جیپ کے آگے پیچھے
دن گزرتا ہے ترا سایۂ ابرو لے کر

فلسفے تُند حقائق کی شعاعیں ڈالیں
شام آتی ہے تری آنکھ کا جادُو لے کر

لنگر انداز ہوں ساحل پہ مشینوں کے جہاز
رات ڈھل جاتی ہے مہکے ہُوئے گیسُو لے کر

میں اسی گیس کی دُنیا میں تعفّن کے قریب
شعر لکھتا ہُوں ترے جسم کی خُوشبُو لے کر

شہرِ جنوں میں جا مری محرومیوں کی رات

شہرِ جنوں میں جا، مری محرومیوں کی رات
اُس شہر میں، جہاں ترے خوں سے حنا بنے

یوں رائیگاں نہ جائے تری آہِ نیم شب
کچھ جنبشِ نسیم بنے، کچھ دعا بنے

اس رات دن کی گردشِ بے سود کی بجائے
کوئی عمودِ فکر، کوئی زاویہ بنے

اک سمت انتہائے اُفق سے نمود ہو
اک گھر دیارِ دیدہ و دل سے جدا بنے

اِک داستانِ کربِ کم آموز کی جگہ
تیری ہزیمتوں سے کوئی واقعہ بنے

تُو ڈھونڈنے کو جائے تڑپنے کی لذتیں
تجھ کو تلاش ہو کہ کوئی بے وفا بنے

وُہ سر بہ خاک ہو تری چوکھٹ کے سامنے
وُہ مرحمت تلاش کرے، تو خُدا بنے

تعبیر

مجھے یقیں تھا کہ تُم نہیں ہو

تھکے ہُوئے کھڑکیوں کے چہرے
جلی ہُوئی آسماں کی رنگت

سیاہ، آفاق تک بگولے
لہُو کے آتش فشاں کی ساعت

وجُود پر ایک بوجھ سا تھا
نہ صُبحِ وعدہ، نہ شام فرقت

اسی مہیب، آتشیں گھڑی میں
کسی کی دستک سُنی تو دِل نے

کہا کہ صحرا کی چوٹ کھائے
کوئی غریب الدیار ہو گا

یہ سچ کہ دل کی ہر ایک دھڑکن
تمہارے درشن کے واسطے تھی

حیات کا ایک ایک لمحہ،
تمہاری آہٹ کا منتظر تھا

مگر اک ایسے دیارِ غم میں
جہاں کی ہر چیز خشمگیں ہو
مجھے یقیں تھا کہ تم نہیں ہو

۲

زمین سکتے میں ہے کہ کیوں کر
زمیں پہ ماہ تاب اُترا!

یہ آگ کیسے بنی شبستاں
کہاں سے آنکھوں کا خواب اُترا

۳

روایتوں کی ہزار صدیوں
سے بڑھ کے یہ لمحہ حَسیں ہے

لہُو میں پھُولوں کے حاشیے ہیں
اُداس کاسے میں انگبیں ہے

یہ تم ہو، یہ ہونٹ ہیں، یہ آنکھیں
مجھے یقیں ہے، مجھے یقیں ہے

بدیسی

ساتھ سمندر پار سے گوری آئی پیا کے دیس
رُوپ بدیسی، لیکن جیون پُورب کا سندیس

لمبی لمبی پلکیں، جن میں تلواروں کی کاٹ
نیلی نیلی آنکھیں، جیسے جمنا جی کے پاٹ

انکھڑیاں یا ٹھنڈے ٹھنڈے دریاؤں میں سیپ
روشن روشن چہرہ، جیسے دیوالی کا دیپ

گندم کی جیسی رنگت کے نرم، سنہرے کیس
آئی پیا کے دیس

تپتی دھرتی، جلتا سورج، نئی نئی ہر بات
اٹھارہ گھنٹوں کے دِن، اور چھے گھنٹوں کی رات

نئے نئے کپڑے پہنے اور سیکھے دُوجے ڈھنگ
نئی نویلی بولی بولے گھر والوں کے سنگ

ٹوٹی پھوٹی اردو، جس کے اُلٹے سیدھے بھیس
آئی پیا کے دیس
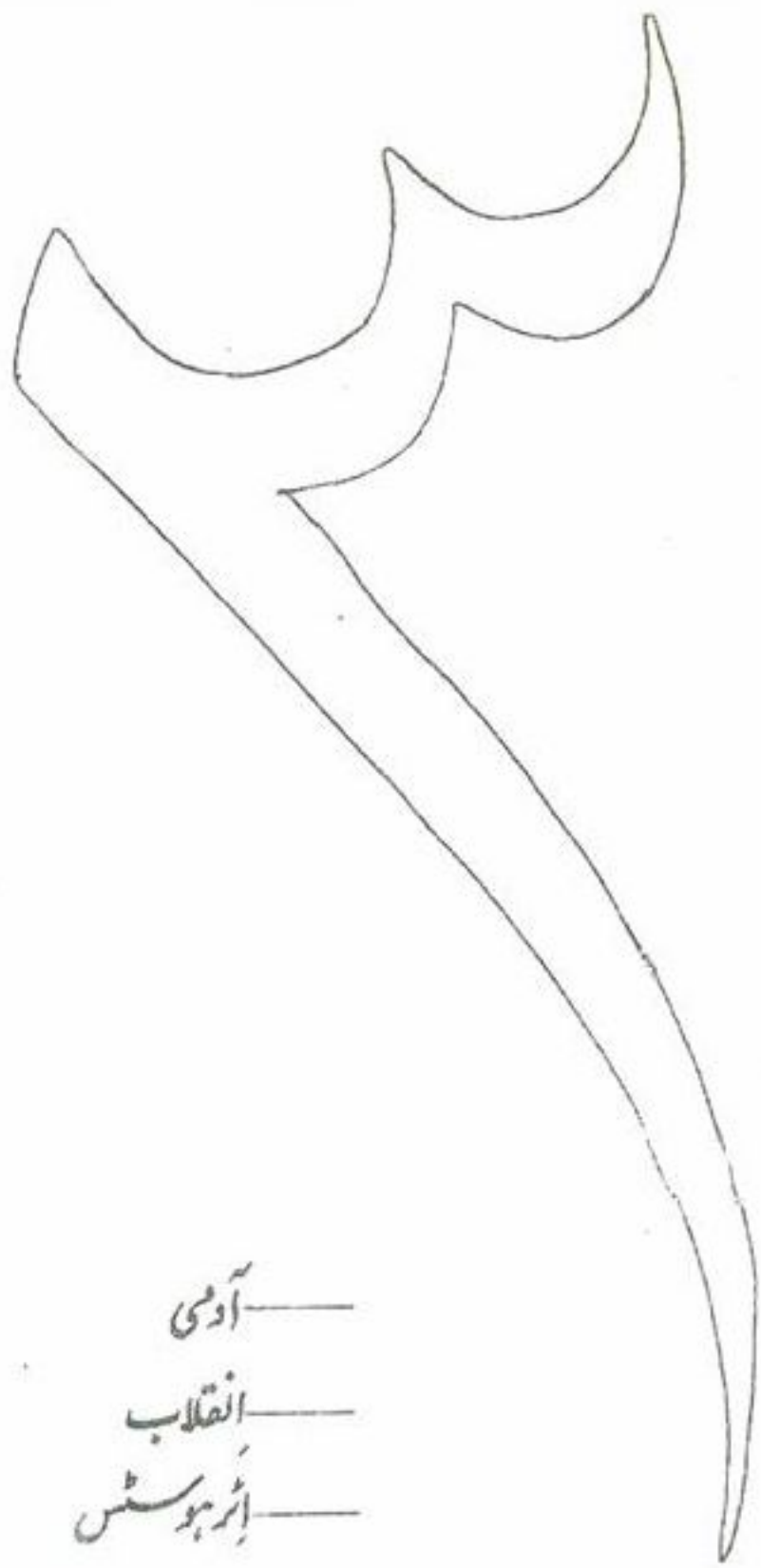
آدمی

مجھ کو محصور کیا ہے مری آگاہی نے
میں نہ آفاق کا پابند، نہ دیواروں کا
میں نہ شبنم کا پرستار، نہ انگاروں کا
اہلِ ایقان کا حامی نہ گنہگاروں کا

نہ خلاؤں کا طلب گار، نہ سیاروں کا

زندگی دھوپ کا میدان بنی بیٹھی ہے

اپنا سایہ بھی گریزاں، ترا داماں بھی خفا
رات کا روپ بھی بیزار، چراغاں بھی خفا
صبحِ یاراں بھی خفا، شامِ غریباں بھی خفا
دُزدِ ایماں بھی خفا، اور نگہباں بھی خفا

خوُد کو دیکھا ہے، تو اس شکل سے خوف آتا ہے

ایک مبہم سی صدا گنبدِ افلاک میں ہے
تارِ بے مایہ کسی دامنِ صد چاک میں ہے
ایک چھوٹی سی کرن مہر کے ادراک میں ہے
جاگ، اے رُوح کی عظمت کہ مری خاک میں ہے

اِنقلاب

یوں ہوا مُنتظرِ ساعتِ نو ہے جیسے
ایک اِک لمحے کی آواز شبستاں بن جائے

ایک اِک لمحہ دبے پاؤں بڑھا آتا ہے
کاش یہ سخت زمیں ابرِ خراماں بن جائے

قُفلِ زنداں کی ابھی آنکھ لگی ہے شاید
آنکھ کھُل جائے، تو ہر خواب بیاباں بن جائے

ایک اِک سانس پہ ہے ساعتِ فردا کا مدار
پھُول بن جائے کہ آتش کدۂ جاں بن جائے

ایک اِک لہر کے مِلنے کی صدا آتی ہے،
جانے، کب سوزِ جگر یورشِ طوفاں بن جائے

ائیر ہوسٹس

شہر کی روشنیاں کرنکِ آوارہ ہیں
نہ وُہ ہوٹل کے دریچے، نہ وُہ بجلی کے ستون
نہ وہ اطرافِ شبستاں کا گُم نام سکون
ہر گھڑی ساعتِ پرواز بنی جاتی ہے

سیکڑوں فیٹ تلے رینگ رہی ہو گی زمیں
کہیں پیٹرول کے مرکز، کہیں سڑکوں کا غُبار
تار کے آہنی کھمبوں کی طرح راہ گزار
مختلف لوگوں کی آواز بنی جاتی ہے

تیرے لہجے میں ہے ترغیب کی یہ کیفیت
کہ مشینوں کی فضا ساز بنی جاتی ہے

اَے مرے دِل کے دھڑکنے سے بہ ظاہر غافل
تیری صُورت تری غمّاز بنی جاتی ہے

ہم سفر انجُمنیں گَرم کیئے بیٹھے ہیں
تو مرا سب سے بڑا راز بنی جاتی ہے

پلیتہ

"چھوڑو، میاں، یہ مشغلۂ شعر و شاعری
آؤ، شکار کے لیئے کہسار کو چلیں

اِک مہ جبیں کے واسطے رونے سے فائدہ
تسکینِ قلب کے لئے بازار کو چلیں

ہاں جنّتِ نگاہ بھی ہو، رنگ و رقص بھی
بے شک کسی حسینہ کے دربار کو چلیں"

ہاں تاج و تخت میں بھی ہے اِک کیفیت مگر
میں کیسے اپنے فقر کا پندار چھوڑ دوں

کس طرح اپنے سائے کو خود سے جدا کروں
کیوں کر یہ طبعِ شاعرِ خوددار چھوڑ دوں

دستار کیسے پھینک دوں ٹھوکر کے واسطے
میخانہ کیسے چھوڑ دوں دفتر کے واسطے

پہلے ہی دن سے ہے مجھ پہ یہ سخن کی صورت

پہلے ہی دن سے ہے مجھ پہ یہ سخن کی صورت
شعر میں دل کا لہو آئے چمن کی صورت

رات کو انجمنِ ذہن میں عریاں ہو کر
جگمگاتی ہے زمیں تیرے بدن کی صورت

ناز کرتی ہے فضا شاہدۂ شب کی طرح
کھیلتی چلتی ہے آواز پون کی صورت

ہائے وہ عارضِ گلنار شفق کی مانند
ہائے وہ رقصِ پُر اسرار کرن کی صورت

نظر آتی ہے ہر اک حرف کے آئینے میں
کبھی دشمن کی، کبھی یارِ کہن کی صورت

کہیں تاریکیٔ افکار میں نکلا ہوا چاند
اور کہیں چاند کے پہلو میں گہن کی صورت

کہیں تخیل کے سینے میں پہاڑوں کی اٹھان
کہیں احساس کے بازو پہ رسن کی صورت

ایک اک ذرّہ چمکتا ہے ستارہ بن کر
ایک اِک یاد تڑپتی ہے وطن کی صورت

دیکھنا اہلِ جنوں ساعتِ جہد آپہنچی

دیکھنا، اہلِ جنوں، ساعتِ جہد آ پُہنچی
اب کے توہینِ لبِ دار نہ ہونے پائے

اب کے کُھل جائیں خزانے نفسِ سوزاں کے
اب کے محرومیٔ اظہار نہ ہونے پائے

یہ جو غدّار ہے اپنی ہی صفِ اوّل میں
غیر کے ہات کی تلوار نہ ہونے پائے

یُوں تو ہے جوہرِ گُفتار بڑا وصف، مگر
وجہ بیمارئ کِردار نہ ہونے پائے

ایسے زخموں کی جراحت سے محبّت سیکھو
جن کو مرہم سے سروکار نہ ہونے پائے

دشت میں خونِ حُسین ابنِ علی بہہ جائے
بیعتِ حاکمِ کُفّار نہ ہونے پائے

یہ نئی نسل اسی انداز سے نکلے سرِ رزم
کہ مُورّخ سے گنہگار نہ ہونے پائے

نہ کوئی مخملی تصویر نہ کوئی نغمہ (ترجمہ)

نہ کوئی مخملی تصویر، نہ کوئی نغمہ
میرے مفہوم کو مفہوم بنا سکتا ہے

اس لیئے، میں نے وہ الفاظ چُنے ہیں جن سے
میرے افکار، تعیش کی حدوں کے باہر
اک نیا دائرہ ذہن بنا سکتے ہوں

دائرہ، جس میں نہیں فکر و نظر کا اُلجھاؤ
اور آئیں گے؛ اگر چاہو، تو تم بھی آ جاؤ

(لوئی میک نیس)

پیدائش سے پہلے (ترجمہ)

ابھی میں پیدا نہیں ہُوا ہوں، مری سُنو

اِن لہُو کے پیاسے مہیب چوہوں کو، ان چھپکلیوں کو،
چمگادڑوں کو میرے قریب آنے سے باز رکھو

ابھی میں پیدا نہیں ہُوا ہوں، مجھے سنبھالو
مجھے یہ ڈر ہے، کہیں یہ انساں حصار میں گھیر لے نہ مُجھ کو
دواؤں سے مجھ کو بھی سُلا دے

حروفِ دانش سے غم بھُلا دے
لہُو کا کچھ ذائقہ چکھا دے

مری فنا، جس میں وُہ مری زندگی کی ساعت گزار
دیں گے

ابھی میں پیدا نہیں ہوا ہُوں، ذرا یہ ناٹک مُجھے
سِکھا دو
بُزرگ جب وعظ کر رہے ہوں، تو اپنا سَر کِس
طرح ہلاؤں؟
میں زعمِ طاقت کے سامنے کیا کروں؟
پہاڑوں کے جبر و ہیبت کے سامنے کیا کروں؟
حقارت کے سامنے، طنز یہ محبت کے سامنے کیا
کروں؟

میں کیا کروں، جب سفید مَوجیں مُجھے جنُوں کی
طرف بُلائیں؟
میں کیا کروں، جب مہیب صحرا مُجھے تباہی
پہ ورغلائیں؟
میں کیا کروں، جب فقیر میرے کرم کی دولت سے
ڈر رہے ہوں؟

ابھی میں پیدا نہیں ہُوا ہوں، مجھے ضرورت ہے
صاف پانی کی،
سبزہ زاروں کی، پیڑ کی چھاؤں کی، کُھلے آسماں کی
چڑیوں کے چہچہوں کی

مجھے ضرورت ہے ذہن کی صاف چاندنی کی
مجھے ضرورت ہے روشنی کی

ابھی میں پیدا نہیں ہُوا ہوں، مرے گُناہوں کو
بخش دینا
گناہ جو میری ذات کے نام پر کرے گی تمہاری دُنیا
جو لفظ مجھ کو ادا کریں گے
خیال جو مجھ کو وا کریں گے

مری دغا، جس کو غیر کی سازشوں نے میری بنا دیا ہے
مری حیاتِ گرسنہ، جو قاتلوں نے خوُد مجھ سے
چھین لی ہے

میں کیا کروں

جب مرے ہی بچے مجھی پہ دُشنام کر رہے ہوں؟

ابھی میں پیدا نہیں ہُوا ہوں، مری سنو ——
مجھ کو ایسے اِنسان سے بچاؤ، جو بھیڑیا ہے
اور ایسے انسان سے بھی، جو یہ سمجھ رہا ہو کہ
وُہ خُدا ہے
ابھی میں پیدا نہیں ہُوا ہوں، مری رگوں میں وُہ
خون بھر دو،
جو میری انسانیت کو اغیار سے بچالے
جو سوچتے ہیں کہ میں مشین اور موت بن جاؤں،
ان کے افکار سے بچالے
جو چاہتے ہیں کہ میں بس ایک شکل و صورت
بن جاؤں، ان کے اصرار سے بچالے
مرے مکمل وجود کو ٹُوٹنے کے اِدبار سے بچالے
مُجھے نہ راس آئے گا ہوا پہ ذرا سے تنکے کی
شکل بننا،

ہتھیلیوں پر نحیف قطرے کی شکل بننا
مجھے نہ پتھر کی زندگی چاہیئے، نہ قطرے کی
چار سانسیں
اگر یہ ممکن نہیں، تو اس راستے سے مجھ کو
جُدا بھی کردو

ابھی میں پیدا نہیں ہُوا ہوں
ابھی سے مجھ کو فنا بھی کردو

(لُوئی میک نیس)

ریسٹ ہاؤس

یہ گاؤں، سہمے ہوئے شیر خوار کی مانند
گھروں کی تیرہ و تاریک خوابگاہوں میں
پڑا ہُوا ہے —— اندھیرے میں آنکھ کھولے ہوئے

ہَوا، مہیب ہَوا، تند بھیڑیئے کی طرح
ہر ایک پیڑ سے بے واسطہ لپٹتی ہے
ہر اِک چراغ کی لَو کی طرف لپکتی ہے

سِوائے ایک شجر کے، جو اس کا مسکن ہے
سِوائے تاجِ شہی کے جو صاحبِ فن ہے
سوائے ایک دیئے کے، جو اب بھی روشن ہے

قبائے ساز

مصطفیٰ زیدی

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی) ۔ لیک روڈ۔ لاہور

تار و پود

دِن کی اک اک بُوند گراں ہے، اک اک جُرعۂ شب نایاب
شام وسَحر کے پیمانے میں جو کچھ ہے، ڈر ڈر کے پیو
آہستہ آہستہ برتو اِن گنتی کی سانسوں کو
دِل کے ہات میں شیشۂ جاں ہے، قطرہ قطرہ کر کے پیو

"نغمگی کے قدِ بالا پر قبائے ساز تنگ"

بُخاری

○

دل میں وُہ دردِ نہاں ہے کہ بتائیں کس کو
ہاں اگر ہے تو کوئی محرمِ اَسرار سُنے

خلوتِ ذہن کے ہر راز کی سرگوشی کو
یہ نہ ہو جائے کہ بازار کا بازار سُنے

نرمیِٔ رمز و کنایہ کا تقاضا یہ ہے
پرتوِ شاخ کہے، سایۂ دیوار سُنے

ہونٹ ہلنے بھی نہ پائیں کہ معانی کھُل جائیں
لمحۂ شوق کہے، ساعتِ دیدار سُنے

مَیں تو سو مرتبہ تیشے کی زباں سے کہہ دُوں
تُو جو افسانۂ فرہاد بس اِک بار سُنے

زخمِ سفر

ہزار راہِ مُغیلاں ہے کارواں کے لیے
لہُو کا رنگ ہے تزئینِ داستاں کے لیے
قدم قدم پہ بڑی سختیاں ہیں جاں کے لیے
کئی فریب کے عشوے ہیں اِمتحاں کے لیے
زمانہ یُوں تو ہر اِک پر نظر نہیں کرتا
قلم کی بے اَدَبی درگزر نہیں کرتا

قلَم میں لرزشِ مژگاں، قلَم میں رِشتۂ جاں
قلَم میں زمزمہ و رَم، قلَم میں شور و فُغاں
قلَم میں جشنِ عُروسی، قلَم میں بیوگیاں
قلَم میں کوہ و بیاباں، قلَم میں کاہکشاں
قلَم میں حِلم بھی ہے ناز اَور وقار بھی ہے
اذانِ صُبح بھی ہے، شامِ بادہ خوار بھی ہے

اِسی کے دم سے گھٹاؤں کے سُرمئی آنچل
اِسی سے ہونٹ بہاراں، اِسی سے آنکھ کنول
یہی کُلاہ کا ہیرا، یہی کمان کا بَل
یہی ہے صُبحِ گُلستاں، یہی شبِ مقتل
بغیر اِس کے رہِ سروری نہیں ملتی
کِسی کو دولتِ پیغمبری نہیں مِلتی

چمن ہزار ہیں، لیکن گُلاب اِس کا ہے
خُدا کا عرش ہے لیکن سحاب اِس کا ہے
کبھی جو ڈھل نہ سکے وُہ شباب اِس کا ہے
ہر ایک عہد کی آنکھوں میں خواب اِس کا ہے
دیارِ عشق میں مجرُوح و بے وطن یہ ہے
حریمِ حُسن میں خُوشبوئے پیرہَن یہ ہے

دِنوں میں ہمہمۂ کارساز اِس کا ہے
شبوں میں زمزمۂ دِل نواز اِس کا ہے
بطُون میں ابدیّت کے راز اِس کا ہے
سرِشک وقت کے ہیں اور گُداز اِس کا ہے
مثالِ حضرتِ آدم گُناہ گار بھی ہے
حریمِ عصمتِ مریم کا پردہ دار بھی ہے

ہر اِک سے بے خبری بھی، ہر اِک کا محرم بھی
شرر بسینہ بھی ہے اور لبِ شبنم بھی
محلِّ زخم بھی ہے اور مقامِ مرہم بھی
ہلالِ عید بھی ہے، عشرۂ محرّم بھی
بغاوتوں کے درخشاں علَم اُٹھائے ہُوئے
جگر کے طاق میں شمعِ مُبیں جلائے ہُوئے

قلم کی راہ میں جو آئے دِل کو مار کے آئے
شبِ درازِ غمِ بے کراں گزار کے آئے
گلے سے طوقِ زمان و مکاں اُتار کے آئے
بڑے بڑوں کو بہ بانگِ دُہل پُکار کے آئے
بہت بہا و طلب ہے رہِ وفا اِس کی
کہ اِنتہائے جنوں سے ہے ابتدا اِس کی

اِدھر بلاؤں پہ جو مُسکرا سکے وُہ آئے
جو تاج و تخت پہ ٹھوکر لگا سکے وُہ آئے
جو آسمان کو نیچا دِکھا سکے وُہ آئے
جو اپنے آپ سے آنکھیں لڑا سکے وُہ آئے
رہ لئے زر کا نہیں جو کفن کا شیدا ہو
اِدھر وُہ آئے جو دار و رسن کا شیدا ہو

جسے خبر ہو کہ کس نے نقاب اُٹھائی ہے
یہ عہدِ گُرز ہے یا عصرِ مومیائی ہے
یہ عادلی ہے کہ نمرُود کی خُدائی ہے
یہ خُونِ دل ہے قلم میں کہ روشنائی ہے
جو نقش و رنگ سے آدابِ سادگی پُوچھے
جو خسروی سے مزاجِ جفاکشی پُوچھے

جو خشتِ حرف سے دیوار و در بناتا ہو
نفس کے لوچ سے تیغ و تبر بناتا ہو
جو آندھیوں میں ستاروں کے گھر بناتا ہو
جو خُود طلسمِ قضا و قدر بناتا ہو
جو ایک سانس میں طے راہِ کائنات کرے
خُدا سے بھی نہ ، سرِ حشر ، دب کے بات کرے

کہاں مقامِ سُخن اور کہاں سیاستِ شب
کہاں یہ اشک کہاں تاجرانِ جشنِ طرب
کہاں رجز کی بلندی کہاں سِلے ہُوئے لب
کہاں زمان و مکاں اور کہاں عراق و عرب
حدُودِ شام و سحر سے نکل گئے کُچھ لوگ
ذرا سی دُھوپ میں آکر پگھل گئے کُچھ لوگ

کسی نے دولتِ فانی کو دیوتا جانا
ادب کو رزق کمانے کا مشغلا جانا
جگر کے خون کو رنگینیٔ حنا جانا
بتانِ ہیکلِ اوہام کو خدا جانا
غمِ حیات کو بے مدعا بنا ڈالا
ہنر کو، کاسۂ دستِ گدا بنا ڈالا

اَب ان میں ذہن کی بازی گری کے قصّے ہیں
عبائے اطلس و تاجِ زری کے قصّے ہیں
رئیسِ وقت کی پیغمبری کے قصّے ہیں
طلسمِ ہوشربا کی پری کے قصّے ہیں
دھواں دھواں ہے فضا سحرِ سامری کی طرح
ضعیف آنکھوں کی دھندلی سی روشنی کی طرح

خمِ شکستۂ تاج و نگیں کے چرچے ہیں
ادائے لیلیٔ جنّت نشیں کے چرچے ہیں
مجاہداتِ فریب آفریں کے چرچے ہیں
مکاشفاتِ بزرگانِ دیں کے چرچے ہیں
کوئی رکوع میں ہے خانقاہ کے آگے
کوئی سجود میں ہے کج کلاہ کے آگے

سُنو قلم کے مُہمّات جاننے والو
دلِ حیات کے ضربات جاننے والو
مزاجِ ارض و سماوات جاننے والو
ادب کے جُملہ مقامات جاننے والو
تمھیں نہ صِرف شبستاں میں جا کے لکھنا ہے
ہر ایک عہد کے زنداں میں جا کے لکھنا ہے

پلک ہی ایک حقیقت نہیں کمان بھی ہے
زمین بھی ہے، فضا بھی ہے، آسمان بھی ہے
جو کاٹ دی ہے حکومت نے وُہ زبان بھی ہے
حُکومتوں پہ جو گذری وُہ داستان بھی ہے
عتاب و لُطف و سزا و جزا کا قِصّہ ہے
رقم کرو کہ یہ قِصّہ وفا کا قِصّہ ہے

لکھو کہ تابع شاہی نہیں مزاجِ عوام
شکست کھا کے رہے گی چراغ سے ہر شام
ہر ایک عہد میں ہوں گے ہزار گُل اندام
ہر ایک عہد میں آئے گا عِشق پر الزام
جہاں بھی مطلعِ حق پر سحاب اُٹھے گا
کسی قلم سے کوئی آفتاب اُٹھے گا

حمد

ہم نے اُس قوّتِ موہُوم کو دیکھا نہ سُنا
ہم نے اُس گوہرِ نادیدہ کو پرکھا نہ چُنا

اِک سواری کہ شناسا نہ تھی، گھر پر اُتری
اِک تجلّی تھی کہ تہذیب نظر پر اُتری

جلوے دیکھے جو کبھی شاملِ ایماں بھی نہ تھے
اور ہم ایسے تن آساں تھے کہ حیراں بھی نہ تھے

دِل کے آغوش میں اک نُور ہُمکتا آیا
ایک لمحہ کئی صدیوں پہ چمکتا آیا

وہم و تشکیک سے اِلہام شعاری نہ رُکی
شب سے شہزادۂ خاور کی سواری نہ رُکی

پتّھروں کے صدفِ تیرہ سے ہیرے اُبھرے
بے کراں موج سے بے نام جزیرے اُبھرے

آیتیں گونج اُٹھیں حکمتِ گویا کے بغیر
مشعلیں جلنے لگیں شعلۂ سینا کے بغیر

نکہتِ بے بصراں دیدہ وری تک پہنچی
ضربِ شیشے پہ لگی، شیشہ گری تک پہنچی

اجنبی شہر سے اِک بُوئے چمن ساز آئی
دم بخود، مُہر بہ لب، وقت سے آواز آئی

رات کا کرب بھی مَیں، صُبح کا آرام بھی مَیں
حدّ و بے حد بھی مَیں، بے نام بھی مَیں، نام بھی مَیں

صحنِ خاموش بھی مَیں، حلقۂ آواز بھی مَیں
دستِ محمود بھی مَیں، آذرِ بُت ساز بھی مَیں

سنگ و سنجاب بھی ہُوں، شعلہ بھی ہُوں، خاک بھی ہُوں
مَیں ترا وہم بھی ہُوں، مَیں ترا ادراک بھی ہُوں

ساز کی گونج بھی ہُوں، تیغ کی جھنکار بھی ہُوں
مَیں کڑی دُھوپ بھی ہُوں، سایۂ دیوار بھی ہُوں

میرا ہی سوزِ خموشی ہے ہر آہنگ کے ساتھ
میری ہی نرمیٔ مسلک ہے رگِ سنگ کے ساتھ

میری رُوداد وُہی ہے جو جہاں پر گزُری
لامکاں پر بھی وُہ گزُری جو مکاں پر گزُری

گردشیں تجھ سے ملیں تو مرے پاس آئیں بھی
مَیں ترا جسم بھی ہُوں مَیں تری پرچھائیں بھی"

آدمی

مجھ کو محصور کیا ہے مری آگاہی نے
مَیں نہ آفاق کا پابند نہ دیواروں کا
مَیں نہ شبنم کا پرستار نہ انگاروں کا
نہ خلاؤں کا طلب گار نہ سیاروں کا

زندگی دھوپ کا میدان بنی بیٹھی ہے
اپنا سایہ بھی گریزاں، ترا داماں بھی خفا
رات کا رُوپ بھی بے زار، چراغاں بھی خفا
صبحِ یاراں بھی خفا، شامِ حریفاں بھی خفا

خود کو دیکھا ہے تو اِس شکل سے خوف آتا ہے
ایک مبہم سی صدا گنبدِ افلاک میں ہے
تارِ بے مایہ کسی دامنِ صد چاک میں ہے
ایک چھوٹی سی کرن مہر کے ادراک میں ہے
جاگ اَے رُوح کی عظمت کہ مری خاک میں ہے

○

کیا کیا نظر کو شوقِ ہوس دیکھنے میں تھا
دیکھا تو ہر جمال اسی آئینے میں تھا

قُلزُم نے بڑھ کے چُوم لیے پھُول سے قدم
دریائے رنگ و نُور ابھی راستے میں تھا

اِک موجِ خُونِ خلق تھی، کِس کی جبیں پہ تھی؟
اِک طوقِ فردِ جُرم تھا، کِس کے گلے میں تھا؟

اِک رشتۂ وفا تھا سو کِس ناشناس سے
اِک دردِ حرزِ جاں تھا سو کِس کے صِلے میں تھا

صہبائے تُند و تیز کی حِدّت کو کیا خبر
شیشے سے پُوچھیے جو مزا ٹُوٹنے میں تھا

کیا کیا رہے ہیں حرف و حکایت کے سِلسلے
وُہ کم سُخن نہیں تھا مگر دیکھنے میں تھا

تا تب تھے اِحتساب سے جب سارے بادہ کش
مجُھ کو یہ اِفتخار کہ مَیں مَے کدے میں تھا

طلسم

بُجھ گیا ہے وُہ ستارہ جو مِری رُوح میں تھا
کھو گئی ہے وُہ حرارت جو تِری یاد میں تھی

وُہ نہیں عِشرتِ آسُودگیٔ منزِل میں
جو کسک جادۂ گُم گشتہ کی اُفتاد میں تھی

دُور اِک شمع لرزتی ہے پسِ پردۂ شب
اِک زمانہ تھا کہ یہ لَو مِری فریاد میں تھی

ایک لاوے کی دھمک آتی تھی کُہساروں سے
اک قیامت کی تپش تیشۂ فرہاد میں تھی

ناسِخِ ساعتِ اِمروز کہاں سے لائے
وُہ کہانی جو نظر بندیٔ اجداد میں تھی

تخلیق

کتنے جاں سوز مراحل سے گزر کر دل نے
کس قدر پیچ و خمِ سُود و زیاں دیکھے ہیں

کتنے گرداب نظر آئے ہیں دَف کے نزدیک
کتنے بھونچال سرِ آبِ رواں دیکھے ہیں

گُونجتے ساز، برستے ہُوئے نغموں کے قریب
دل کو تھامے ہُوئے اربابِ مغاں دیکھے ہیں

ڈُوبنے والوں کے ہمراہ بھنْور میں رہ کر
لبِ ساحل کے ضیابار مکاں دیکھے ہیں

جام کے رنگ میں پائی ہے لہُو کی سُرخی
کاہ کے دوش پہ سو کوہِ گراں دیکھے ہیں

مُدّتوں اپنے دلِ زار کا ماتم کر کے
خُود سے بڑھ کر بھی کئی سوختہ جاں دیکھے ہیں

سنسناتے ہُوئے ذرّات کے رُخساروں پر
تُند سُورج کے طمانچوں کے نشاں دیکھے ہیں

موت کو جن کے تصوّر سے پسینہ آجائے
سِینۂ زیست میں وُہ زخمِ نہاں دیکھے ہیں

تب کہیں جا کے اِن اشعار کے گہوارے میں
اِک بصیرت کے چمکنے کے نشاں دیکھے ہیں

تہدیہ

سرور و کیف کے آیات لے کر آیا ہوں
نگاہِ پیرِ خرابات لے کر آیا ہوں

زمیں کے کرب میں شامل ہوا ہوں راہرو
دلِ شکستہ کی سوغات لے کر آیا ہوں

نظر میں عصرِ جواں کی بغاوتوں کا غرور
جگر میں سوزِ روایات لے کر آیا ہوں

جہانِ تیرہ کی خاموشیوں کے حلقے میں
چراغِ حرف و حکایات لے کر آیا ہوں

کدھر ہے چشمۂ حیواں مِرا طواف کرے
گناہ گار ہوں، ظلمات لے کر آیا ہوں

بلند و پست سے کہہ دو کہ صف میں آجائیں
زمیں پہ ذوقِ مساوات لے کر آیا ہوں

بہت سے آئے ہیں تیری گلی میں لیکن میں
متاعِ عزتِ سادات لے کر آیا ہوں

تشکک

مجھ کو دیے
اکثر خداؤں نے بہ طورِ پیش کش دُنیا و دیں
مَیں، مُصطفےٰ زیدی، ضعیف الاعتقاد و کم یقیں

لیکن نہیں
اَے پڑھنے والو تم کو شاید اِس کا اندازہ نہیں
جن راستوں سے ہو کے آیا ہے یہ دَورِ آخریں

اِس میں ملے
صحرا، بگولے، دشت، دریا، آگ، نفرت، تیرگی
اِلحان، گلشن، رنگ، خوشبو، پیار، کونپل، انگبیں

اکثر یہ گھر
پیغمبروں کی سانس کی شمعیں نہ روشن کرسکیں
اکثر اِسے لَو دے گئی اِبلیس کی تیرہ جبیں

دُنیا نے بھی
دار پر مِرے نقشِ جنوں چھوڑے نہیں، حالانکہ وہ
سج دھج کے نکلی بھی مثالِ لُعبتانِ مصر چیں

اُس ذات کے
بارے میں اِک عُقدے کے پیچھے سیکڑوں عُقدے بنے
ہے یا نہیں کے بعد
ممکن ہے
کہ ممکن بھی نہیں

اندیشہ ہائے دُور و دراز

اَب سے پہلے بھی اِس محفِلِ رقص میں گھنگروؤں کے چھناکے بکھرتے رہے
قبل اور وسط اور حال کے قافلے سب اِسی راستے سے گذرتے رہے
مندروں میں کھنکتی رہیں گھنٹیاں، مسجدوں کے منارے اُبھرتے رہے

اَب سے پہلے بھی آسُودگی کے لئے آسماں کی طرف آنکھ اُٹھتی رہی
اَب سے پہلے بھی حُسنِ سفر کے لئے کہکشاں کی طرف آنکھ اُٹھتی رہی
اَب سے پہلے بھی تحقیق سے بدگماں، اِعتقادات کی بات کرتے رہے

خُوبصُورت سی اِک ناؤ دے کر سخن گر نے لہروں کے چکّر میں اُلجھا دِیا
مُعتبر رہنماؤں نے دھوکے دِیے، خِضر صُورت بزُرگوں نے بہکا دِیا
خِضر صُورت بزُرگوں کی آنکھوں میں تقدیس کے سُرخ ڈورے اُبھرتے رہے

آدمی کے تراشے ہُوئے وہم نے آدمی کے لیے خار و خس چُن دِیے
قیصروں سے غُلامی کا تمغہ مِلا دیوتاؤں نے افلاس کے ہُن دِیے
پاک پروردگارِ مہ و مہر کی رحمتوں سے اندھیرے نکھرتے رہے

چشمِ مُشتاق کو رُخ کی تابانیاں دیکھنے کی سعادت نہیں مِل سکی
شام گذرے بھی مدّت ہُوئی اور ابھی آئینے کو اجازت نہیں مِل سکی
صُبح بھی تجھ سے پُوچھیں گے اے دردِ دل تیرے گیسُو کہاں تک سنورتے رہے

تنہا

میں وُہی قطرۂ بے بحر وُہی دشت نورد
اپنے کاندھوں پہ اُٹھائے ہُوئے صحرا کا طلسم
اپنے سینے میں چھپائے ہُوئے سیلاب کا درد
ٹوٹ کر رشتۂ تسبیح سے آ نکلا ہُوں
دِل کی دھڑکن میں دبائے ہُوئے اعمال کی فرد
میرے دامن میں برستے ہُوئے لمحوں کا خروش
میری پلکوں پہ بگولوں کی اُڑائی ہُوئی گرد

لاکھ لہروں سے اُٹھا ہے مری فطرت کا خمیر
لاکھ قلزم مرے سینے میں رواں رہتے ہیں
دن کو کرنیں مرے افکار کا مُنہ دھوتی ہیں
شب کو تارے مری جانب نِگراں رہتے ہیں

میرے ماتھے پہ جھلکتا ہے ندامت بن کر
ابنِ مریم کا وہ جلوہ جو کلیسا میں نہیں

راندۂ موج بھی ہیں، مجرمِ ذرات بھی ہیں

میرا قصّہ کسی افسانۂ دریا میں نہیں
میری تاریخ کسی صفحۂ صحرا میں نہیں

○

کفِ مومن سے، نہ دروازۂ دوراں سے مِلا
رشتۂ درد اُسی دُشمنِ ایماں سے مِلا

اس کا رونا ہے کہ پیماں شکنی کے باوصف
وُہ ستمگر اُسی پیشانیٔ خنداں سے مِلا

طالبِ دستِ ہوس اَور کئی دامن تھے
ہم سے ملتا جو نہ یُوسف کے گریباں سے مِلا

کوئی باقی نہیں اَب ترکِ تعلّق کے لئے
وُہ بھی جا کر صفِ احبابِ گُریزاں سے مِلا

کیا کہیں اُس کو جو محفل میں شناسا بھی نہ تھا
کبھی خلوت میں در آیا تو دِل وجاں سے مِلا

مَیں اُسی کوہ صِفَت خُون کی اِک بُوند ہُوں جو
ریگ زارِ نجف و خاکِ خُراساں سے مِلا

سچائی

مشرِق کے پنڈِت، مغرِب کے گِرجا والے
صُبح ہُوئی اَور سچّائی کے پیچھے بھاگے
سچّائی اِک قحبہ تھی جو رات کو تھک کر
سوئی ہُوئی تھی، شور سُنا تو خوف کے مارے
تھر تھر کانپی، روزِ عدالت سے گھبرائی
بھیس بدل کر پیچھے نکلی، آگے آگے
مشرِق کے پنڈِت، مغرِب کے گِرجا والے

لبِ مرگ

قوم کے پاس اب رہا کیا ہے
شاعرانہ تعلّیوں کے سِوا
ہیں معالج مگر دوا کیا دیں
جانکنی میں، تسلّیوں کے سِوا

سایہ

تمام شہر پہ آسیب سا مُسلّط ہے
دُھواں دُھواں ہیں دریچے، ہوا نہیں آتی
ہر ایک سمت سے چیخیں سُنائی دیتی ہیں
صدائے ہم نفَس و آشنا نہیں آتی

گھنے درخت، در و بام، نغمہ و فانُوس
تمام سحر و طلسمات و سایہ و کابُوس
ہر ایک راہ پہ آوازِ پائے نامعلُوم
ہر ایک موڑ پہ اَرواحِ زِشت و بَد کا جلُوس

سفید چاند کی اُجلی قبائے سیمیں پر
سِیاہ و سرد کفن کا گماں گزرتا ہے
فضا کے تخت پہ چمگادڑوں کے حلقے میں
کوئی خلا کی گھنی رات سے اُترتا ہے

تمام شہر پہ آسیب سا مُسلّط ہے
کوئی چراغ جلاؤ، کوئی حدیث پڑھو
کوئی چراغ برنگِ عذارِ لالہ رُخاں
کوئی حدیث باندازِ صدقۂ دِل و جاں
کوئی کِرن پئے تزئینِ غُرفہ و محراب
کوئی نوا پئے درماندگان و سوختہ جاں

سُنا ہے عالمِ رُوحانیاں کے خانہ بدوش
سحر کی روشنیوں سے گُریز کرتے ہیں
سحر نہیں ہے تو مشعل کا آسرا لاؤ
لبوں پہ دِل کی سُلگتی ہُوئی دُعا لاؤ
دِلوں کے غسُلِ طہارت کے واسطے جا کر
کہیں سے خُونِ شہیدانِ نینوا لاؤ

ہر اِک قبا پہ کثافت کے داغ گہرے ہیں
لہُو کی بُوند سے یہ پیرہن دُھلیں تو دُھلیں
ہوا چلے تو چلے، بادباں کھُلیں تو کھُلیں

دردِ دل بھی غمِ دوراں کے برابر سے اُٹھا
آگ صحرا میں لگی اور دُھواں گھر سے اُٹھا

تابشِ حُسن بھی تھی، آتشِ دُنیا بھی، مگر
شعلہ جس نے مجھے پھُونکا مرے اندر سے اُٹھا

کسی موسم کی فقیروں کو ضرورت نہ رہی
آگ بھی، اَبر بھی، طُوفان بھی ساغر سے اُٹھا

بے صدف کِتنے ہی دریاؤں سے کچھُ بھی نہ ہُوا
بوجھ قطرے کا تھا ایسا کہ سمندر سے اُٹھا

چاند سے شِکوہ بلَب ہُوں کہ سُلایا کیوں تھا
میں کہ خُورشیدِ جہاںتاب کی ٹھوکر سے اُٹھا

حال احوال

ایک اکیلے ہم ایسے جو آدھی رات ڈھلے
چھوڑ کے کاہکشاں کا رستہ انگاروں پہ چلے

سچّائی کی منزِل جگمگ جگمگ کرتی ہے
لیکن اُس تک کیسے پہنچیں راہ میں آگ جلے

عہدوں کے وُہ پودے آئے کچھ لوگوں کے ہات
صُبح کو جن کا بیج لگے اور شام کے وقت پھلے

کیسے کیسے سنگھاسن پے کر بیٹھ گئے عیّار
مُلّا، پنڈت، ڈاکو، افسر، ایک سے ایک بھلے

کوئی خِرد کی محفل میں اقوال و کمال بتائے
کوئی بزمِ جمال سجائے جام پہ جام ڈھلے

اک پرچم کا نشان کبُوتر اَور اِک کا شہباز
وُہی زمین کے خُون کے پیاسے ہر پرچم کے تلے

افسانوں کے لُطف کے پیچھے روتی ہوئی تاریخ
ظُلم کی تلواروں کے نیچے مظلُوموں کے گلے

زیدیؔ اَب سنیاسی بن کر ہم لے لیں بن باس
ماتھے پر سیندُور لگائیے مُنہ پر راکھ ملے

کونپلیں ریت سے پھُوٹیں گی سرِ دشتِ وفا
آبیاری کے لِیے خُونِ جگر تو لاؤ

کِسی گھُونگھٹ سے نِکل آئے گا رُخسار کا چاند
جو اُسے دیکھ سکے ایسی نظر تو لاؤ

شہر کے کُوچہ و بازار میں سنّاٹا ہے
آج کیا سانحہ گزُرا ہے خبر تو لاؤ

ایک لمحے کے لِیے اُس نے کِیا ہے اقرار
ایک لمحے کے لِیے عُمرِ خضر تو لاؤ

جس دن سے اپنا طرزِ فقیرانہ چھُٹ گیا
شاہی تو مل گئی دلِ شاہانہ چھُٹ گیا

کوئی تو غم گُسار تھا کوئی تو دوست تھا
اب کس کے پاس جائیں کہ ویرانہ چھُٹ گیا

دُنیا تمام چھُٹ گئی پیمانے کے لئے
وُہ مے کدے میں آئے تو پیمانہ چھُٹ گیا

کیا تیز پا تھے دِن کی تمازت کے قافلے
ہاتوں سے رشتۂ شب افسانہ چھُٹ گیا

اِک دن حساب ہو گا کہ دُنیا کے واسطے
کِن صاحبوں کا مسلکِ رندانہ چھُٹ گیا

شہرِ جنوں میں چل

شہرِ جنوں میں چل مری محرومیوں کی رات
اُس شہر میں جہاں ترے خوں سے حنا بنے
یوں رائگاں نہ جائے تری آہِ نیم شب
کچھ جُنبشِ نسیم بنے کچھ دُعا بنے
اِس رات دن کی گردشِ بے سُود کے عوض
کوئی عمودِ فکر، کوئی زاویہ بنے
اک سمت انتہائے اُفق سے نمود ہو
اک گھر دیارِ دیدہ و دل سے جدا بنے
اک داستانِ کربِ کم آموز کی جگہ
تیری ہزیمتوں سے کوئی واقعہ بنے
تو ڈھونڈنے کو جائے تڑپنے کی لذتیں
تجھ کو تلاش ہو کہ کوئی بے وفا بنے
وُہ سر بہ خاک ہو تری چوکھٹ کے سامنے
وُہ مرحمت تلاش کرے تو خدا بنے

غمِ دَوراں نے بھی سیکھے غمِ جاناں کے چلن
وُہی سوچی ہُوئی چالیں وُہی بے ساختہ پن

وُہی اِقرار میں اِنکار کے لاکھوں پہلُو
وُہی ہونٹوں پہ تبسّم وُہی ابرُو پہ شکن

کِس کو دیکھا ہے کہ پندارِ نظر کے باوصف
یک لمحے کے لِئے رُک گئی دِل کی دھڑکن

کون سی فصل میں اِس بار مِلے ہیں تجھ سے
کہ نہ پروائے گریباں ہے نہ فِکرِ دامن

اب تو چُبھتی ہے ہوا برف کے میدانوں کی
اِن دِنوں جسم کے احساس سے جلتا تھا بدن

اَیسی سُونی تو کبھی شامِ غریباں بھی نہ تھی
دِل بُجھے جاتے ہیں اَے تیرگیٔ صُبحِ وطن

منزل منزل

آج کیوں میرے شب و روز ہیں محرومِ گداز
اَے مِری رُوح کے نغمے مِرے دِل کی آواز
اِک نہ اِک غم ہے نشاطِ سحر و شام کے ساتھ
اَور اِس غم کا نہ مفہوم نہ مقصد نہ جواز
مَیں تو اِقبال کی چوکھٹ سے بھی مایُوس آیا
میرے اشکوں کا مداوا نہ بدخشاں نہ حجاز

چند لمحوں سے تمنّا کہ دوامی بن جائیں
ایک مرکز پہ رہے سُرخ لہُو کی ہلچل
کبھی ہر گام پہ ٹھوکر، کبھی منزل منزل
اَے جہانِ گزراں ایک سے انداز پہ چل
دِن کو مہکی ہُوئی رُت، شام کو تپتی ہُوئی ریت
زِندگی اَیسے طِلسمات کے حلقے سے نِکل

کہیں ہر لمحہ لگاوٹ، کہیں ملنے سے گریز
دلِ محبوب نما اور سنبھل اور سنبھل

اور کہیں یہ ــــ کہ اگر ایک پلک بھی ٹھہرے
کوئی لمحہ ــــ تو ہر اِک سانس گراں ہو جائے
اگر اِک گلشن بے خار رہے دامنِ وقت
یہ جہانِ گذراں ریگِ رواں ہو جائے
ایسا مذہب کہ خود اُس وجہ تعالیٰ سے گریز
ایسا اِلحاد کہ سجدے میں نہاں ہو جائے

اَے مری رُوح کے نغمے، مرے دِل کی آواز
لُطفِ شب تاب یہی رقصِ شرر ہو شاید
کتنے کوسوں کوئی منزل نہ نشانِ منزل
جُستجو ہی کوئی عرفانِ سفر ہو شاید
کوئی اِلحاد میں نازاں کوئی ایمان میں گُم
کبھی اِس دیدہ و دِل کی بھی سحر ہو شاید
میری راتوں میں نہاں ہو نئے سُورج کی کرن
کم نگاہی میں ہی پوشیدہ نظر ہو شاید

کارواں

اِسی طرف سے زمانے کے قافلے گُزرے
سکُوتِ شامِ غریباں کے خلفشار میں گم
ذرا سا راگ خموشی کے دوش پر لرزاں
ذرا سی بُوند پُر اسرار آبشار میں گم
گھنے اندھیرے میں گُمنام راہ رَو کی طرح
کوئی چراغ چمکتی ہُوئی قطار میں گم
فضا میں سوئی ہُوئی گھنٹیوں کی آوازیں
ستارے نیل کی خاموش جُوئبار میں گم
سُلگتے، پیار کی شِدّت سے کانپتے ہُوئے ہونٹ
کِسی کی وعدہ وفائی کے اِعتبار میں گم
نہ جانے کِتنی اُمیدیں اُفق سے آنکھ لگائے
سحر کی آس میں فردا کے اِنتظار میں گم

نئی آبادی

سنبھل سنبھل کے چلے دوستانِ عہدِ طرب
کوئی قدیم رفاقت گلے نہ پڑ جائے
ستم زدوں کی محبت گلے نہ پڑ جائے
کہیں پکار نہ لے درد کی کوئی چلمن
کہیں خلوص کے شعلے پکڑ نہ لیں دامن
اُتر نہ جائے رُخِ دست گیر کا غازہ
لپٹ نہ جائے قدم سے وفا کا دروازہ
دیارِ غم کی صداقت گلے نہ پڑ جائے

ادھر ستائے ہُوئے دِل نظر بچا کے چلے
ضمیرِ سنگ میں شیشے کی آبرو کیا تھی
کھلے تھے زخم ستاروں کی جستجو کیا تھی
جُھکی ہُوئی تھیں نگاہیں تھمے ہُوئے تھے قدم
سِلی ہُوئی تھیں زبانیں جلے ہُوئے تھے عَلَم
وُہ خامشی کہ سُراغِ صدا نہ مِل جائے
وُہ احتیاط کہ دردِ آشنا نہ مِل جائے
دُعا کو ہات نہ اُٹھیں، پتہ نہ مِل جائے

غرض کِسی کو کِسی سے کوئی گلہ نہ ہُوا
مہاجروں کے محلّے میں حادثہ نہ ہُوا

روکتا ہے غمِ اظہار سے پندار مجھے
میرے اشکوں سے چھپا لے مِرے رخسار مجھے

دیکھ اے دشتِ جنوں بھید نہ کھلنے پائے
ڈھونڈنے آئے ہیں گھر کے در و دیوار مجھے

سی دیے ہونٹ اُسی شخص کی مجبوری نے
جس کی قربت نے کیا محرمِ اسرار مجھے

میری آنکھوں کی طرف دیکھ رہے ہیں انجم
جیسے پہچان گئی رُوحِ شبِ تار مجھے

جنسِ ویرانیٔ صحرا میری دُوکان میں ہے
کیا خریدے گا ترے شہر کا بازار مجھے

جرسِ گُل نے کئی بار پُکارا لیکن
لے گئی راہ سے زنجیر کی جھنکار مجھے

ناوکِ ظُلم اُٹھا، دشنۂ اندوہ سنبھال
لُطف کے خنجرِ بے نام سے مت مار مجھے

ساری دُنیا میں گھنی رات کا سنّاٹا تھا
صحنِ زِنداں میں مِلے صُبح کے آثار مجھے

ڈھلے گی رات آئے گی سحر آہستہ آہستہ
پیو اُن انکھڑیوں کے نام پر آہستہ آہستہ

دِکھا دینا اُسے زخمِ جگر آہستہ آہستہ
سمجھ کر، سوچ کر، پہچان کر آہستہ آہستہ

اُٹھا دینا حجابِ رسمیاتِ درمیاں لیکن
خطاب آہستہ آہستہ نظر آہستہ آہستہ

دریچوں کو تو دیکھو، چلمنوں کے راز تو سمجھو
اُٹھیں گے پردہ ہائے بام و در آہستہ آہستہ

ابھی تاروں سے کھیلو چاندنی سے دل کو بہلاؤ
مِلے گی اُس کے چہرے کی سحر آہستہ آہستہ

کہیں شامِ بلا ہو گی کہیں صُبحِ کماں داراں
کٹے گا زُلف و مژگاں کا سفر آہستہ آہستہ

یکایک ایسے جل بُجھنے میں لُطفِ جاں کنی کب تھا
جلے اِک شمع پر ہم بھی مگر آہستہ آہستہ

○

آندھی چلی تو نقشِ کفِ پا نہیں مِلا
دِل جس سے مِل گیا وُہ دوبارا نہیں مِلا
ہم انجمن میں سب کی طرف دیکھتے رہے
اپنی طرح سے کوئی اکیلا نہیں مِلا
آواز کو تو کون سمجھتا کہ دُور دُور
خاموشیوں کا درد شناسا نہیں مِلا
قدموں کو شوقِ آبلہ پائی تو مِل گیا
لیکن بہ ظرفِ وُسعتِ صحرا نہیں مِلا
کنعاں میں بھی نصیب ہُوئی خود دریدگی
چاکِ قبا کو دستِ زلیخا نہیں مِلا
مہر و وفا کے دشت نوردو جواب دو
تم کو بھی وُہ غزال مِلا یا نہیں مِلا
کچّے گھڑے نے جیت لی ندّی چڑھی ہُوئی
مضبُوط کشتیوں کو کِنارا نہیں مِلا

واقف نہیں اِس راز سے آشفتہ سراں بھی
غم تیشۂ فرہاد بھی غم سنگِ گراں بھی

اُس شخص سے وابستہ خموشی بھی بیاں بھی
جو نشترِ فصّاد بھی ہے اور رگِ جاں بھی

کِس سے کہیں اُس حُسن کا افسانہ کہ جِس کو
کہتے ہیں کہ ظالم ہے تو رُکتی ہے زباں بھی

ہاں یہ خمِ گردن ہے یہ تابانیٔ افشاں
پہلو میں مِرے قوس بھی ہے، کاہ کشاں بھی

اَے چارہ گرو چارہ گرو ہم کو بتاؤ
کیا اَیسے ہی آثار نمایاں ہیں وہاں بھی

چونکی ہے وُہ کِس ناز سے، اَے صُبحِ خوش آغاز
زُلفوں کی گھٹا بھی ہے چراغوں کا دُھواں بھی

دستور

کل رات کو محرابِ خرابات تھی روشن
اشعار کے حلقے میں تھی آیات کی آمد

اربابِ حکایت نے سجائی تھی اَدب سے
افکار کے قالین پہ اقوال کی مسند

اخلاص کے رشتوں پہ چھلکتے تھے نئے جام
با وضعِ قدیمانۂ اخلاقِ اَب وجد

رقصندہ و رخشندہ و تابندہ و پُرکار
جوّالہ و قتّالہ و سوزندہ و سرمد

ہر ذرّہ گراں مایہ و آفاق نشیمن
ہر قطرہ گُہر رِشتہ و الماس و زَبَرجَد

نغموں کا تلاطم تھا کہ تفسیرِ دو عالم
ہر گیت کا اِک گھیر تھا ہر بول کا اِک قد

ہر دُھن سے ترشتے تھے تھرکتے ہُوئے اصنام
ہر راگ میں اِک خال تھا، ہر تان میں اِک خد

گھُلتا ہُوا ساغر میں ہر اسلوبِ کم و بیش
مِٹتا ہُوا ہر تفرقۂ احمر و اسوَد

صہبا کی حرارت سے درکتی تھی صُراحی
بیٹھے تھے تہی جام مگر حضرتِ امجدؔ[1]

وابستگیٔ شرع نظر بندیٔ رِنداں
پابندیٔ آئین و گرفتاریٔ مقصد

آخر حرم و دَیر کے مینار پُکارے
اَے واقفِ اسرارِ دلِ ہوّض و ابجد

دستُورِ قوانینِ ازل مِٹ نہیں سکتے
ہر شرع کا اِک وقت ہے ہر بات کی اِک حد

اِس شہر اَور اُس شہر پہ موقُوف نہیں ہے
وِیراں شود آں شہر کہ مے خانہ نہ دارد[2]

[1] جناب مجید امجد   [2] کاظم قمی

دُنیا

اک ہم ہی نہیں کُشتۂ رفتارِ زمانہ
یہ تندیٔ رخشِ گُذَراں سب کے لئے ہے

رقّاصۂ طنّاز ہو یا بسملِ مجرُوح
اسبابِ دِل آویزیٔ جاں سب کے لئے ہے

اک طرزِ تفکّر ہے ارسطو ہو کہ خیّام
دُنیائے معانی و بیاں سب کے لئے ہے

خاموشِ محبّت ہو کہ میدان کی للکار
محرُومیٔ گفتار و زباں سب کے لئے ہے

بستی ہو فقیروں کی کہ عشرت گہِ کسریٰ
بُجھتی ہُوئی شمعوں کا دُھواں سب کے لئے ہے

دریُوزہ گرِ شہر ہو یا خُسروِ آفاق
پندارِ فلاں ابنِ فلاں سب کے لئے ہے

"زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے"
وُہ خود اگر کہیں مِلتا تو گفتگو کرتے

وُہ زخم جِس کو کِیا نوکِ آفتاب سے چاک
اُسی کو سوزنِ مہتاب سے رفو کرتے

سوادِ دل میں لہو کا سُراغ بھی نہ مِلا
کِسے امام بناتے کہاں وضو کرتے

وُہ اِک طلسم تھا، قُربت میں اُس کے عُمر کٹی
گلے لگا کے اُسے، اُس کی آرزو کرتے

حلف اُٹھائے ہیں مجبوریوں نے جِس کے لیے
اُسے بھی لوگ کِسی روز قِبلہ رُو کرتے

جنُوں کے ساتھ بھی رسمیں، خرد کے ساتھ بھی قید
کِسے رفیق بناتے کِسے عدُو کرتے

حجاب اُٹھا دِیے خُود ہی نِگار خانوں نے
ہمیں دِماغ کہاں تھا کہ آرزو کرتے

سفرِ آخرِ شب

بہت قریب سے آئی ہوائے دامنِ گُل
کسی کے رُوئے بہاریں نے حالِ دِل پُوچھا

کہ اے فراق کی راتیں گذارنے والو
خمارِ آخرِ شب کا مزاج کیسا تھا

تُمھارے ساتھ رہے کون کون سے تارے
سیاہ رات میں کِس کِس نے تم کو چھوڑ دیا

بِچھڑ گئے کہ دغا دے گئے شریکِ سفر
اُلجھ گیا کہ وفا کا طِلسم ٹُوٹ گیا

نصیب ہو گیا کِس کِس کو قُربِ سُلطانی
مِزاج کِس کا یہاں تک قلندرانہ رہا

فِگار ہو گئے کانٹوں سے پیرہن کِتنے
زمیں کو رشکِ چمن کر گیا لہُو کِس کا

سُنائیں یا نہ سُنائیں حکایتِ شبِ غم
کہ حرف حرف صحیفہ ہے، اشک اشک قلم
کن آنسوؤں سے بتائیں کہ حال کیسا ہے
بس اِس قدر ہے کہ جیسے ہیں سرفراز ہیں، ہم
ستیزہ کار رہے ہیں جہاں بھی اُلجھے ہیں
شعارِ راہِ زناں سے مُسافروں کے قدم

ہزار دشت پڑے، لاکھ آفتاب اُبھرے
جبیں پہ گرد، پلک پر نمی نہیں آئی
کہاں کہاں نہ لُٹا کارواں فقیروں کا
متاعِ درد میں کوئی کمی نہیں آئی

لاینحل

زباں پہ مُہرِ گدائی ہے، کِس سے بات کروں
حرُوف کاسۂ بے مایہ ہیں، قلم کشکول
ضمیر بے حِس و حرکت ہے زیست بے پہلُو
شِکَن ہے دامنِ ہستی میں، آستین پہ جھول
مَیں خود طِلسم کی پریوں سے بے کِنار رہُوا
کِسے کہوں کہ مری رُوح کے دریچے کھول

میں اِک سراب کی خواہش پہ بیچ آیا ہُوں
تمام بادہ و ساغر، تمام تشنہ لبی
حریمِ عقل میں جس کا کوئی جواز نہ تھا
نِشاطِ دل تھی وُہی زندگی کی بے سببی
اُجڑ گئے مِرے گُلگشت، میرے رُکنا باد
مری دُعائے سحر، میری آہِ نیم شبی

کہاں وُہ دِن تھے کہ پروائے ننگ و نام نہ تھی
کہاں یہ وقت کہ سایہ سنبھل کے چلتا ہے
مجھے کِسی بھی تعیّن پہ اختیار نہیں
یہ کوئی اَور مِرے راستے بدلتا ہے
جنُوں سے رسم نہ رکھّوں تو جاں سُلگتی ہے
طلب کا قرض اُتاروں تو جِسم جلتا ہے

ناشناس

(۱)

کتنے لہجوں کی کٹاریں مری گردن پہ چلیں
کتنے الفاظ کا سیسہ مرے کانوں میں گھلا

جس میں اک سمت دھندلکا تھا اور اک سمت غبار
اُس ترازو پہ مرے درد کا ساماں تُلا

کم نگاہی نے بصیرت پہ اُٹھائے نیزے
جوئے تقلید میں پیراہنِ افکار دھلا

قحط ایسا تھا کہ برپا نہ ہوئی مجلسِ عشق
حبس ایسا تھا کہ تحقیق کا پرچم نہ کھلا

کون سے دیس میں رہتے ہیں وہ مونس جن کی
روز اک بات سناتے تھے سنانے والے

ٹھوکروں میں ہے متاعِ دلِ ویراں کب سے
کیا ہُوئے غم کو سر آنکھوں پہ بِٹھانے والے

رات سُنسان ہے، بے نُور سِتارے مدّھم
کیا ہُوئے راہ میں پلکوں کو بچھانے والے

اَب تو وُہ دن بھی نہیں ہیں کہ مرے نام کے ساتھ
آپ کا نام بھی لیتے تھے زمانے والے

ناشناس

(۲)

اہلِ منزل کی مُسافر پہ یہ ترچھی نظریں
میزباں کی سُوئے مہماں یہ نگاہِ اکراہ

اَلحذر خُون بہاتے ہُوئے آداب کرخت
الاَماں تیر چلاتے ہُوئے اخلاقِ سیاہ

یہ خط و خال سے چھنتی ہُوئی نفرت کی شعاع
یہ جبینوں کی لکیروں سے اُبلتی ہُوئی ڈاہ

شہر کے زلزلہ بردوش، گلی کُوچوں میں
یہ کڑکتے ہُوئے لہجے، یہ جگر سوز نگاہ

اُس ترازُو میں بٹھایا ہے فلک نے مجھ کو
جس میں تُلتے ہیں حریفانِ تمدُّن کے گناہ

آدمیّت کا یہ فُقدان کہ دیکھا نہ سُنا
اجنبیّت کا یہ قاموس کہ مِلتی نہیں تھاہ

نہ وُہ رِم جِھم نہ وُہ پُروا، نہ وُہ کوئی لبِ جُو
رُخِ گردُوں پہ دُھواں ہے، لبِ گیتی پہ کراہ

میرے ہم راز، مِرے ناز اُٹھانے والے
کون سے دیس میں ہیں کوئی بتا دے لِلّٰہ

اُف یہ طُوفان، یہ گرداب، یہ پچھاؤ، یہ رات
کِس طرف ہیں مِری کشتی کے پُرانے ملاّح

تُند جذبات کا پھیلاؤ، الٰہی توبہ
سخت الفاظ کا پتھراؤ، عیاذاً بِاللہ

رہ و رسمِ آشنائی

زمیں نئی تھی، فلک ناشناس تھا جب ہم
تِری گلی سے نکل کر سوئے زمانہ چلے
نظر جھکا کے بانداز مجرمانہ چلے

چلے بجیب دریدہ، بدامنِ صد چاک
کہ جیسے جنسِ دل وجاں گنوا کے آئے ہیں
تمام نقدِ سیادت لٹا کے آئے ہیں

جہاں اِک عمر کٹی تھی، اُسی قلمرو میں
شناخت کے لئے ہر شاہراہ نے ٹوکا
ہر اِک نگاہ کے نیزے نے راستہ روکا

جہاں جلے تھے ترے حُسنِ آتشیں کے کنول
وہاں الاؤ تو کیا، راکھ کا نشاں بھی نہ تھا
چراغِ کُشتۂ محفل دُھواں دُھواں بھی نہ تھا

مُسافرت نے پُکارا نئے اُفق کی طرف
اگر وفا کی شریعت کا یہ صِلہ ہو گا
نئے اُفق سے تعارُف کے بعد کیا ہو گا

بُجھ گئی شمعِ حرم، بابِ کلیسا نہ کھُلا
کھُل گئے زخم کے لب تیرا دریچہ نہ کھُلا

درِ توبہ سے بگولوں کی طرح گذرے لوگ
اَبر کی طرح اُمڈ آئے جو مَے خانہ کھُلا

شہر در شہر پھری میرے گُناہوں کی بیاض
بعض نظروں پہ مِرا سوزِ حکیمانہ کھُلا

نازنینوں میں رسائی کا یہ عالم تھا کبھی
لاکھ پہروں میں بھی کاشانے پہ کاشانہ کھُلا

اَب جو بے باک ہُوئے بھی تو بہ صد اندیشہ
اب جو اِک شخص کھُلا بھی تو حجابانہ کھُلا

مِل کے بھی تجھ سے رہی اب کے طبیعت ایسے
جَیسے بادل سا گھِر آیا جو نہ برسا نہ کھُلا

ہم پری زادوں میں کھیلے، شبِ افسوں میں پلے
ہم سے بھی تیرے طلسمات کا عُقدا نہ کھُلا

ایک اِک شکل کو دیکھا ہے بڑی حیرت سے
اجنبی کون ہے اور کون شناسا نہ کھُلا

ریت پر پھینک گئی عقل کی گستاخ لبی
پھر کبھی کشف و کرامات کا دریا نہ کھُلا

اَے دَورِ کور پرور

اَب وُہ خوشی نہ وُہ غم، خنداں ہیں اَب نہ گِریاں
کِس کِس کو رو چُکے ہیں اَے حادثاتِ دوراں

ترتیبِ زِندگی نے دُنیا اُجاڑ دی ہے
اَے چشمِ لااُبالی اَے گیسُوئے پریشاں

دِن رات کا تسلسل بے ربط ہو چکا ہے
اب ہم ہیں اَور خموشی یا وحشتِ غزالاں

یا دِن کو خاکِ صحرا یا شب کو دشت و دریا
یا شغلِ جام و صہبا اَے جانِ مے فروشاں

ٹُوٹا ہُوا ہے بَربط سُونی پڑی ہے محفِل
اَے رنگ و لحن و نغمہ اَے صدرِ بزمِ رِنداں

پھُولوں سے کھیلتا تھا، جن میں کبھی لڑکپن
کانٹے چبھو رہی ہیں، سینے میں اَب وُہ گلیاں

جیسے کسی کی آہٹ، راتوں کو مقبروں میں
ہر بات دردآگیں، ہر راگ وحشت افشاں

یادوں کی چلمنوں سے لمحے پکارتے ہیں
آسیب بن کے چھت پر اُترا ہے ماہِ تاباں

سفّاک سانحوں کی روندی ہوئی قبائیں
خوں خوار حادثوں کے پھاڑے ہُوئے گریباں

جیسے کوئی کہانی رُوحوں کی انجمن میں
ہر بات بے حقیقت، ہر شے طِلسم افشاں

ٹِیلوں کے دامنوں میں صحرائیوں کی قبریں
قبروں کے حاشیوں پر سہما ہُوا چراغاں

کِن ساعتوں سے کھیلیں کِن صُورتوں کو دیکھیں
جُوئے بہارِ ساکن شہرِ نگار ویراں

کِتنی بصیرتوں کی آنکھیں اُجڑ چکی ہیں
اَے دورِ کور پرور! اَے عصرِ کم نگاہاں!

مقبروں سے اُٹھی ہُوئی آندھی
ٹہنیوں سے اُلجھ کے چلتی ہے
خشک پلکوں پہ آنسوؤں کی اُمید
پے بہ پے کروٹیں بدلتی ہے
ایک اک عکس سانس لیتا ہے
ایک اک یاد آنکھ ملتی ہے
جیسے صحرا میں سر جھکائے ہُوئے
حاجیوں کی قطار چلتی ہے

زرد چنگاریوں کے دامن میں
یُوں سُلگتا ہے سرد آتش دان
جیسے بچّوں کی بھُوک کے آگے
ایک نادار باپ کا اِیمان

دم بخُود خامشی میں دھیرے سے
زرد پتّے قدم اُٹھاتے ہیں
یاد کے کارواں اندھیرے میں
خواب کی طرح سرسراتے ہیں
کھڑکیوں کے ڈرے ہُوئے چہرے
اپنی آہٹ سے کانپ جاتے ہیں

دِل کی قربان گاہ کے آگے
ایک ٹوٹا ہُوا دیا بھی نہیں
کِسی پیپل کے نرم سائے میں
کوئی پتھر کا دیوتا بھی نہیں
رُوح کے کاسۂ گدائی کو
چار ٹکڑوں کا آسرا بھی نہیں

لمبی چوڑی سڑک کے دامن پر
قمقمے سہمے سہمے جلتے ہیں
جیسے اکثر بڑے گھرانوں میں
فاقہ کش رِشتہ دار پلتے ہیں

سوچتا ہُوں کہ اِس دیار سے دُور
ایک ایسا بھی دیس ہے جس کی
رات تاروں میں سج کے آئے گی
صُبح ہو گی تو گھر کے گوشوں میں
تیری معصوم مُسکراہٹ کی
نرم سی دُھوپ پھیل جائے گی

تری ہنسی

فلک کا ایک تقاضا تھا ابنِ آدم سے
سُلگ سُلگ کے رہے اَور پلک جھپک نہ سکے
ترس رہا ہو فضا کا مہیب سنّاٹا
سڈول پاؤں کی پائل مگر چھنک نہ سکے
کلی کے اِذنِ تبسّم کے ساتھ شرط یہ ہے
کہ دیر تک کسی آغوش میں مہک نہ سکے

میں سوچتا ہُوں کہ یہ تیری بے حجاب ہنسی!
مِزاجِ زیست سے اِس درجہ مُختلِف کیوں ہے
یہ ایک شمع جسے صُبح کا یقین نہیں
جگر کے زخمِ فروزاں سے منحرف کیوں ہے

بھرا ہوا ہے نگاہوں میں زندگی کے دُھواں
بس ایک شعلہ شب تاب میں شرر کیوں ہے

مرے وجُود میں جس سے کئی خراشیں ہیں
وُہ اِک شکن ترے ماتھے پہ مختصر کیوں ہے
جمی ہُوئی ہے ستاروں پہ آنسوؤں کی نمی
ترے چراغ کی لَو اِتنی تیز تر کیوں ہے

نئے شوالے میں جا کر کسی کے تیشے نے
بہت سے بُت تو گرائے بہت سے بُت نہ گرے

بس ایک خندۂ بے باک ہی سے کیا ہوگا
لہُو کی زحمتِ اقدام بھی ضروری ہے
ذرا سی جُرأتِ ادراک ہی سے کیا ہوگا

گُریز و رجعت و تخریب ہی سہی لیکن
کوئی تڑپ، کوئی حسرت، کوئی مُراد تو ہے
تری ہنسی سے تو میری شکست ہی بہتر
مری شکست میں تھوڑا سا اِعتماد تو ہے

اِس قدر اَب غمِ دَوراں کی فراوانی ہے
تُو بھی مِنجُملۂ اسبابِ پریشانی ہے

مُجھ کو اِس شہر سے کُچھ دُور ٹھہر جانے دو
میرے ہمراہ مِری بے سروسامانی ہے

آنکھ جُھک جاتی ہے جب بندِ قبا کُھلتے ہیں
تجھ میں اُٹھتے ہُوئے خُورشید کی عُریانی ہے

اِک تِرا لمحۂ اقرار نہیں مر سکتا
اَور ہر لمحہ زمانے کی طرح فانی ہے

کُوچۂ دوست سے آگے ہے بہت دشتِ جنُوں
عِشق والوں نے ابھی خاک کہاں چھانی ہے

اِس طرح ہوش گنوانا بھی کوئی بات نہیں
اَور یُوں ہوش سے رہنے میں بھی نادانی ہے

طیّارہ

فضائے بے کراں کی وُسعتوں سے بولتا ہُوا
قوی، جوان بازوؤں کے پنکھ تولتا ہُوا
عظیم ماورا کے بِستروں پہ رولتا ہُوا

اُٹھا۔ تو بادلوں کے قافلے قدم پہ جُھک گئے
بڑھا۔ تو قوس و کہکشاں کے پیچ و خم سُبک گئے
گرج کے جَست کی تو آندھیوں کے ہات رُک گئے

وُہ اَور ہیں جو اجنبی دیار کی ہوس میں تھے
کہ ہم اسی زمیں کی زُلفِ نارسا کے بس میں تھے
نہیں تو، مہر و ماہ و مُشتری بھی دسترس میں تھے

ایئرہوسٹس

شہر کی روشنیاں کرنک آوارہ ہیں
نہ وُہ ہوٹل کے دریچے نہ وُہ بجلی کے ستُون
نہ وُہ اطراف نہ رفتار کا گمنام سکُون
ہر گھڑی عشوۂ پرواز بنی جاتی ہے

سیکڑوں فیٹ تلے رینگ رہی ہوگی زمین
کہیں پٹرول کے مرکز، کہیں سڑکوں کا غبار
تار کے آہنی کھمبوں میں گھری راہ گُذار
صِرف اِک دُور کی آواز بنی جاتی ہے

تیرے لہجے میں ہے ترغیب کی یہ کیفیّت
کہ مشینوں کی فضا ساز بنی جاتی ہے

اے مرے دل کے دھڑکنے سے بظاہر غافل
تیری صورت تری غمّاز بنی جاتی ہے

ہم سفر انجمنیں گرم کیے بیٹھے ہیں
تُو مرا سب سے بڑا راز بنی جاتی ہے

جب ہوا شب کو بدلتی ہوئی پہلو آئی
مُدتوں اپنے بدن سے تِری خُوشبو آئی

میرے نغمات کی تقدیر نہ پہنچے تجھ تک
میری فریاد کی قسمت کہ تجھے چُھو آئی

اپنی آنکھوں سے لگاتی ہیں زمانے کے قدم
شہر کی راہ گزاروں میں مِری خُو آئی

ہاں نمازوں کا اثر دیکھ لیا پچھلی رات
مَیں اِدھر گھر سے گیا تھا کہ اُدھر تُو آئی

مُژدہ اے دِل کسی پہلو تو قرار آ ہی گیا
منزلِ دار کٹی، ساعتِ گیسو آئی

ہم کافروں کی مشقِ سُخَن ہائے گُفتنی
اُس مرحلے پہ آئی کہ اِلہام ہو گئی

دُنیا کی بے اصُول عداوت تو دیکھیے
ہم بُوالہوس بنے تو وفا عام ہو گئی

کلْ رات، اُس کے اَور مِرے ہونٹوں میں تیرا عکس
اَیسے پڑا کہ رات تِرے نام ہو گئی

٥

Last night
Between her lips and mine
Thy Shadow fell
The night was thine

بزم میں باعثِ تاخیر ہُوا کرتے تھے
ہم کبھی تیرے عناں گیر ہُوا کرتے تھے

اَے کہ اَب بھُول گیا رنگِ حنا بھی تیرا
خط کبھی خُون سے تحریر ہُوا کرتے تھے

سایۂ زُلف میں ہر رات کو سو تاج محل
میرے انفاس میں تعمیر ہُوا کرتے تھے

ہجر کا لُطف بھی باقی نہیں اَے موسمِ عقل
اِن دِنوں نالۂ شبگیر ہُوا کرتے تھے

ان دِنوں دشت نوردی میں مزا آتا تھا
پاؤں میں حلقۂ زنجیر ہُوا کرتے تھے

خواب میں تجھ سے مُلاقات رہا کرتی تھی
خواب شرمندۂ تعبیر ہُوا کرتے تھے

وُہ کہ اِحسان ہی اِحسان نظر آتا تھا
ہم کہ تقصیر ہی تقصیر ہُوا کرتے تھے

نہاں ہے سب سے مرا دردِ سینۂ بیتاب
سوائے دیدۂ بے خوابِ انجُم و مہ تاب

تمھیں تو خیر مرے غم کدے سے جانا تھا
کہاں گئیں مری نیندیں کدھر گئے مرے خواب

سفینہ ڈُوب گیا لیکن اِس وقار کے ساتھ
کہ سر اُٹھا نہ سکا پھر کہیں کوئی گرداب

عجیب بارشِ نیساں ہوئی ہے اَب کی برس
صدف صدف شبِ وعدہ ہے اَور گہر کم یاب

حدُودِ مے کدہ و مدرسہ گرا نہ سکے
یہ محرمانِ کلیسا یہ عارفانِ کتاب

وہاں بھی بزمِ خرد میں ہزار پابندی
یہاں بھی محفلِ رِنداں میں سیکڑوں آداب

مَیں تشنہ کامِ غمِ آگہی کہاں جاؤں
اِدھر شعُور کا صحرا اُدھر نظر کا سراب

تُو اپنے جلوۂ عُریاں سے شرمسار نہ ہو
یہی تمامِ نظارہ یہی کمالِ حجاب

بے سمتی

گیئر بدلتے ہُوتے، مُنہ سے پھینک کر سگرٹ
ڈرائیور نے ٹریفک کو ماں کی گالی دی
کہا، حضُور کہاں کیڈلک، کہاں بیجُو

کہاں حکایتِ شیریں دہان و شہد لباں
کہ ایک سیر شکر کا نہ مِل سکا پرمِٹ
کہ دفتروں کو چلاتے ہیں تلخ گو بابُو

گماں بن گئی تہذیبِ رُستم و سُہراب
حکُومتوں نے بہ حقِّ خزانہ ضبط کیے
رمُوزِ کیسۂ مازندراں و کیخسرو

تمام دستخطی فائلوں میں ڈوب گئیں
پری رُخانِ عجم کی جُھکی جُھکی پلکیں!
طلسمِ ہوش رُبا کا گھنا گھنا جادُو

کہاں مسائلِ رُوحانیت: کہاں عرفان
مکان، قلّتِ اسباب، کثرتِ اولاد
شکار. بینک، برج، ریس، غم، دوا، دارُو

یہ تھوڑی دُور پہ دُوکانیں فاحشاؤں کی
لبوں پہ آخرِ شب کی بجھی ہُوئی بیڑی
بدن میں تلخیِ شہوت سے تارکول کی بُو

شعُور و بے خبری کی حدیں نہیں ملتیں
اب اُن کو صُورِ سرافیل کیا جگائے گا
جگا چُکا جنھیں مِل میں لگا ہُوا بھونپو

ہر ایک شب مِری محبُوبہ مجھ سے ملتی ہے
لبوں پہ سحرِ کُناں میکس فیکٹر کی ہنسی
کُتّن کا حُسنِ نظر، ریولان کے ابرُو

عدالتوں میں ہُوا فیصلہ دِل و جاں کا
نہ وُہ سُہاگ کی لَو آئینے کے چہرے پر
نہ وُہ دُلھن کی نگاہوں میں حیرتِ آہُو

جہاز اُڑ گئے بمباریوں کے عزم کے ساتھ
کہیں سے دِل کی صدا آئی اِس طرح جیسے
فِلپؔ کے بلب کے آگے چراغ کے آنسُو

نظر جُھکائے ہُوئے قافلے چلے آئے
ہزار صُبحِ بنارس نے راستہ روکا
ہزار شامِ اودھ کے بکھر گئے گیسُو

ہر ایک نیم پہ جھُولے کی ڈوریاں لٹکیں
ہر ایک کھیت میں سرسوں کی بالیاں مہکیں
دِلوں کے زخم کو لیکن نہ بھر سکی خُوشبو

ادب کی ایک جماعت کا فیصلہ یہ ہے
کہ رُکنیت کی بنا پر خزَف بھی کہلائے
چراغِ لالہ و سیّارۂ فلک پہلو

کسے بتاؤں کہ اے میرے سوگوار وطن
کبھی کبھی تجھے تنہائیوں میں سوچا ہے
تو دِل کی آنکھ نے روئے ہیں خُون کے آنسُو

یہ قطرے قطرے پہ اعلانِ قُلزم و جیحُون
ذرا ذرا سی نمی پر اُمیدِ زرخیزی
یہ دشتِ بے سروساماں! یہ آفتاب! یہ لُو

مِرے وطن، مِرے مجبُور، تن فگار وطن
مَیں چاہتا ہُوں تجھے تیری راہ مِل جائے
میں نیویارک کا دُشمن نہ ماسکو کا عدُو

جلے جلائے کلیسا، لُٹے لُٹائے حرم
طلُوع ہو تو کِدھر سے نئی سحر کا گجر
سکُوت طوق بہ دست و صدا رسن بہ گلُو

شفا نصِیب ہو کیسے مرِیضِ افکار
بڑھے تو کیسے بڑھے قافلہ خیالوں کا
ضمیر و نُطق پہ پہرے قلم پہ گستاپو

تمام مشرقِ وُسطیٰ کا ایک کلچر ہے
ہر اک درخت میں آبِ حیاتِ انگلستان
ہر ایک فصل میں واشنگٹن کا جوشِ نمُو

کہیں سے آئی صَدا عِلم سب سے اعلیٰ ہے
کہیں سے آئی صَدا عِشق سب سے برتر ہے
کہیں سے آئی صدا لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوْ

نہ نجات نہ آوارگی نہ سادہ روی
علاجِ تیرگیٔ میکدہ نہ عقل نہ عِشق
نہ مُلحدوں کے پیالے نہ صُوفیوں کے کدو

دِل و نظر کی یہ واماندگی یہ بے سمتی
مُبصّرو کوئی بھرپُور فلسفہ لاؤ
یہ چاک، سوزنِ مذہب سے بھی ہُوا نہ رفُو

کاروبار

دماغ شل ہے، دل ایک اک آرزو کا مدفن بنا ہوا ہے
اِک ایسا مندر، جو کب سے چمگادڑوں کا مسکن بنا ہوا ہے
نشیب میں جیسے بارشوں کا کھڑا ہوا بے کنار پانی
بغیر مقصد کی بحث، اخلاقیات کی بے اثر کہانی
سحر سے بے زار، رات سے بے نیاز، لمحات سے گریزاں
نہ فکرِ فردا، نہ حال و ماضی، نہ صبحِ خنداں، نہ شامِ گریاں

پکارتا ہے کوئی تو کہتا ہوں اس کو سُن کر بھی کیا کرو گے
اِدھر گذر کر بھی کیا ملے گا، اُدھر نہ جا کر بھی کیا کرو گے
شفق نظر کا فریب ہے تتلیوں کی رنگت میں کچھ نہیں ہے
فراق میں کیا طلسم ہوگا جب اُس کی قربت میں کچھ نہیں ہے
لہو کی گرمی ہے کم سِنی کی دلیل، اِس سے نجات پاؤ
یہ نظم تکمیل پا کے بھی کیا کرے گی ـــ دفتر کے کیس لاؤ

ساری محفل لُطفِ بیاں پر جھُوم رہی ہے
دِل میں ہے جو شہرِ خموشاں کِس سے کہیئے

ساعتِ گُل کے دیکھنے والے آئے ہُوئے ہیں
شبنم تیرا گریۂ پنہاں کِس سے کہیئے

شام سے زخموں کی دُوکان سجائی ہوئی ہے
اپنا یہ اندازِ چراغاں کِس سے کہیئے

اَوجِ فضا پر تیز ہوا کا دم گھُٹتا ہے
وُسعت وُسعت تنگیٔ زنداں کِس سے کہیئے

بازار

وُہی ذِمّہ دارانِ ناموسِ اُمّت، وُہی حامیانِ حَرَم بِک چُکے ہیں
جو لَوح و قلم کی حِفاظت کو نِکلے تھے خُود اُن کے لَوح و قلم بِک چُکے ہیں

خطیبانِ بزمِ صَفا لُٹ گئے ہیں، حریفانِ بَیتُ الصّنم بِک چُکے ہیں
کُچھ آدرش خندہ بہ لَب مر گئے ہیں، کچھ افکار با چشمِ نم بِک چُکے ہیں

اُصولوں کی مظلومیت کون دیکھے، کِسے اِس کی جُرأت کہ اِس کربلا میں
اماموں کا خُوں دربہ در بہہ چُکا ہے، رسُولوں کے نقشِ قدم بِک چُکے ہیں

بڑے فخر سے بیچ منڈی میں نیلام کر دی گئی عِصمتِ حَرف و حِکمت
بڑے ناز سے چوک میں دستِ ذہنِ امیرانِ سَیف و قلم بِک چُکے ہیں

نجیبانِ خود دار و حق کوش نِکلے ہیں سَطوت کی چوکھٹ پہ سجدے کی خاطر
اَدیبانِ والا تَبار و رَئیسانِ شہرِ سَبا و صَنم بِک چُکے ہیں

ہر اِک نغمہ فریاد میں ڈھل گیا ہے، ہر آواز دار و رسَن بن چُکی ہے
یہاں زندگی مکر و فن بن چُکی ہے، خلُوص و رواج و حشم بِک چُکے ہیں

یہاں ایک آنسو کی پروا ہے کِس کو، یہاں مرگِ انبوہ کا جشن ہو گا
یہاں ایک رستے کے مِٹنے کا کیا غم، ہر اِک راہ کے پیچ و خم بِک چکے ہیں

مری ایک مسجد ہے اَب تک فروزاں سو کب تک کہ بُجھنے کو ہے شمعِ ایماں
مرا ایک جامِ سفالیں بچا ہے سو کیا ہے کہ سب جامِ جم بِک چکے ہیں

رِشتۂ جام و سبُو

جانے کب ابر سے نِکلے مِرا کھویا ہُوا چاند
جانے کب مجلسِ اربابِ وفا روشن ہو
راستے نُورِ طلب، شامِ سفر عکس ہی عکس
ڈُوبتے، کانپتے، سہمے ہُوئے، بُجھتے ہُوئے دِل
درد کا بوجھ اُٹھائے ہُوئے، گھبرائے ہُوئے
صُبح کے کفش زدہ، رات کے ٹُھکرائے ہُوئے

جانے کب حلقۂ گرداب سے اُبھرے ساحل
سر پٹکتی ہوئی موجوں کا تلاطم کم ہو
جانے کب گُونجتی لہروں کی صدا مدّھم ہو
کف اُگلتا ہُوا طُوفان، پُر اسرار ہوا
غیر محفُوظ خلاؤں میں زمیں کا بن باس
نہ فضا لُطف پہ مائل نہ فلک درد شناس

کر دیئے ترک قبیلوں نے جنوں کے رِشتے
زخم کس طرح بھریں، چاکِ جگر کیسے سِلیں
سرحدیں آگ کا میدان بنی بیٹھی ہیں
اَے غزالانِ چمن اَب کے مِلیں یا نہ مِلیں

مِل کے بیٹھیں بھی تو جانے کوئی کیا بات کہے
رِشتۂ جام و سبُو یاد رہے یا نہ رہے

ایک گمنام سپاہی کی قبر پر

تیری محراب پہ اے عصرِ کہن کی تاریخ
صرف گوتم کے حسیں بُت کا تبسّم کیوں ہے
کس لئے کیل سے لٹکی ہے فقط ایک صلیب
ایک زنجیر کے حلقے کا ترنّم کیوں ہے
اِک ارسطو سے ہے کیوں گوشۂ دانش پُر نور
ایک سُقراط کے سینے کا تلاطم کیوں ہے

اسی محراب کے سائے میں کئی ابنِ علی
کئی خونخوار یزیدوں سے رہے گرمِ ستیز
تیرے مسلک میں ہُوئی نام ونسب کی توقیر
تیرا ہیرو کوئی خسرو ہے تو کوئی پرویز
تُو نے اقوام کے انبوہ میں وُہ لوگ چُنے
جن میں سے کوئی جہانگیر ہے کوئی چنگیز

تجھ سے ممکن ہو تو اَے ناقدِ ایّامِ کہن!
اپنے گمنام خزانوں کو اُٹھا کر رکھ لے
رات بے نام شہیدوں کے لئے روتی ہے
ان شہیدوں کا لہو دِل سے لگا کر رکھ لے
ماؤں کے میلے دوپٹّوں میں ہیں جو آنسو جذب
اُن کو آنکھوں کے چراغوں میں سجا کر رکھ لے

ہو گئے راکھ جو پَر، چُن اُنہیں خاکستر سے
سُرخیٔ جُرأتِ پروانہ بنے یا نہ بنے
عام شکلوں میں بھی ہے عارضِ سلمیٰ کا جمال
ان کو بھی دیکھ، صنم خانہ بنے یا نہ بنے
زِیست کے جوہرِ نایاب کی تشہیر تو کر
اس کی تشہیر سے افسانہ بنے یا نہ بنے

ایک تاریک ستارہ ہے اُفق پر غلطاں
اک الم ناک خموشی ہے پسِ پردۂ ساز

یہ اندھیرے میں کِسے شوقِ پذیرائی ہے
یہ خلاؤں میں کِسے ڈھونڈ رہی ہے آواز

مرہمِ لُطف و وفا تجھ کو کہاں آئے زخم
ہم سفر تجھ کو کہاں لے گئی تیری پرواز

زندگی نغمہ و آہنگ تھی تیرے دم سے
موت نے چھین لیا کیسے ترِے ہات سے ساز

کِن چٹانوں سے کروں سنگ دلی کا شِکوہ
اَے فضاؤں کے سُخن فہم صبا کے ھمراز

آگ کِس طرح ترِے جسم کے نزدیک آئی
کیسے پٹرول کے شُعلوں سے دبا شعلہ ساز

کون سے دشت میں لی آخری ہچکی تُو نے
کِس دھماکے سے نگُوں ہو گئی تیری آواز

کیوں دُعائیں نہ بنیں تیری نگہباں اُس وقت
کیوں نہ کام آئی مِرے چاکِ گریباں کی نماز

میرے محبُوب گلے مِل کے لِپٹ کر مِل جا
میرے بھائی ترِے مِلنے کے ہزاروں انداز

آوازکے سائے

خبر نہیں تم کہاں ہو یارو

ہماری اُفتادِ روز و شب کی،
تمھیں خبر مل سکی، کہ تم بھی،
رہینِ دستِ خزاں ہو یارو
دِنوں میں تفریق مِٹ چُکی ہے
کہ وقت سے خُوش گماں ہو یارو
ابھی لڑکپن کے حوصلے ہیں
کہ بے سر و سائباں ہو یارو

ہماری اُفتادِ روز و شب میں
نہ جانے کتنی ہی بار اب تک
دھنک بنی اور بکھر چُکی ہے
عُروسِ شب اپنی خلوتوں سے
سحر کو محرُوم کر چُکی ہے

دہکتے صحرا میں دھوپ کھا کر
شفق کی رنگت اُتر چکی ہے
بہار کا تعزیہ اُٹھانے
نگارِ یک شب گذر چکی ہے

اُمیدِ نوروز ہے کہ تم بھی
بہار کے نوحہ خواں ہو یارو

تمھاری یادوں کے قافلے کا
تھکا ہوا اجنبی مُسافر
ہر اک کو آواز دے رہا ہے
خفا ہو یا بے زباں ہو یارو

یہ آدمی کی گزرگاہ

زندگی آج تُو کِس طرف آ گئی

صُبح کی سیپیا روشنی چھوڑ کر
مدھ بھری شام کی کم سِنی چھوڑ کر
اوس پیتی ہُوئی چاندنی چھوڑ کر
اُس کے مُکھڑے کی مِیٹھی نمی چھوڑ کر

زندگی آج تُو کِس طرف آ گئی

اِس نئے دیس کے اجنبی راستے
کِتنے تاریک، کِتنے پُر اسرار ہیں
آج تو جیسے وحشی قبیلے یہاں
اِک نئے آدمی کے لہُو کے لِیے
جِسم پر راکھ مَل کر نِکل آئے ہیں

آنکھ میں چبھ رہا ہے کسیلا دُھواں
جسم کو چھو رہی ہیں خُنک سوئیاں
ہر قدم پر ڈھچر، ہر طرف ہڈیاں

وقت کی خوف سے سانس رُکتی ہوئی
رات کے بوجھ سے ہانپتی خامشی
ہر طرف تیرگی تیرگی تیرگی

پیڑ کے رُوپ میں کوئی دُشمن نہ ہو
پاس کے موڑ پر کوئی رہزن نہ ہو
یہ کھنڈر کوئی رُوحوں کا مسکن نہ ہو

اِس بھٹکتی صدا میں کوئی راز ہے
یہ پُرانا دیا کِس کا غمّاز ہے؟
کِس کی آہٹ ہے یہ کِس کی آواز ہے؟

کِس لِیے آج سامانِ شبخُون ہیں؟
کون سے راز سینوں میں مدفُون ہیں؟
کِس کے لشکر اب آمادۂ خُون ہیں؟

ہر طرف دُھند ہے ہر طرف سہم ہے
کوئی صاحبِ نظر ہے کہ نافہم ہے؟
سانپ کی سرسراہٹ ہے یا وہم ہے؟

زندگی آج تُو کِس طرف آگئی

مَیں تری راہ کِس طرح روشن کرُوں
میری ویران آنکھوں میں آنسُو نہیں
تیرے سازوں کی تحریک کے واسطے
میرے ہونٹوں پہ گیتوں کا جادُو نہیں
رات سُنسان ہے راہ وِیران ہے
کوئی نغمہ نہیں کوئی خُوشبُو نہیں

آج تک مَیں نے تیرے لِیے رات دِن
موتیوں اور چراغوں کے ہر تھال پر
کِتنے گجرے عقیدت سے حاضر کِیے
کنواریوں کے بدن کی جواں اوس سے
تیرے پھُولوں کے چہروں کو ضو بخش دی
جب بُجھی جا رہی تھی تری دِل کشی
تیرا مُنہ چُوم کر تجُھ کو نَو بخش دی

چُوڑیوں کی کھنک سے تِرے واسطے
اَیسے معصُوم نغمے مُرتّب کِیے
جن کو سُن کر ستاروں کے اِک شہر میں
کرِشن کے ہات سے بانسرِی چھُٹ گئی

تیری ہر نِیند کو، تیرے ہر خواب کو
مَیں نے پریوں کی زُلفوں کا بِستر دیا
نَو عرُوسوں کی شرماہٹیں سونپ دیں
لَے کے گہنے، تبسّم کا زیور دِیا
اپسراؤں کے سِینوں کے بھونچال سے
حِدّتیں چھِین کر تجھ کو پیکر دِیا
تیرے بالوں پہ غزلوں سے اَفشاں چُنی
تیرے ماتھے کو نظموں کا جھُومر دِیا
اُنگلیوں کو اجنتا کی صنعت گری
انکھڑیوں کو بنارس کا منظر دِیا

ایک تشبیہ سوچی کمر کے لِیے
اِستعارے تراشے نظر کے لِیے
جِسم اَور خوُن سے ماورا کہہ دیا
اَور اِک روز تجھ کو خُدا کہہ دیا

زندگی آج تو کس طرف آ گئی

مَیں چٹانوں سے فرہاد بن کر لڑا
تُو نے تیشے میں میرا لہو بھر دیا
والمیک اور بُدھ بن کے آواز دی
تُو نے صحراؤں میں مجھ کو گُم کر دیا
ٹرائے کی جنگ میں تیرا ہومر بنا
مجھ سے آنکھوں کی سب نعمتیں چھن گئیں
دشتِ احساس میں تیرا شاعر بنا
تیرے کانٹوں نے میری رگیں چھیل دیں
مَیں نے ڈھونڈا تجھے ذہنِ سُقراط میں
اور مجھے زہر کا جام پینا پڑا
مَیں نے جانا تجھے بے حد و بے مکاں
اور مجھے قید خانوں میں جینا پڑا

لے I fall upon the thorns of life
I bleed

— Shelley

حادثوں نے بجھا دی عقیدت کی لَو
تجربوں نے عقائد کو گُم کر دیا
پھر بھی مَیں تیرے دامن کو تھامے ہُوئے
زخم دھوتا رہا اور گاتا رہا

اَور مہکے یہ زخموں کا بن یا نہیں
اَور کچھ دِن رہے یہ لگن یا نہیں
اَے مری ہم سفر مجُھ کو آواز دے
مُسکرائے گی کوئی کِرن یا نہیں

جِس کھنڈر پر گھنی موت کا راج ہے
اُس سے اُبھرے گی صُبحِ وطن یا نہیں
اِقتصادی خیالات کی جنگ میں
جیت جائے گا شاعر کا فن یا نہیں

گانے والیاں

اُس کے سازندوں کی آنکھوں میں نہ دُرگانہ ملھار
صرف یہ فکر کہ بے خواب رہیں گے کب تک
اپنے بے نام مقدّر کو سہیں گے کب تک

جاگتے ہونٹ، چمکتے ہوئے عارض کا نکھار
مُسکراتے ہُوئے یُوں اشک بہیں گے کب تک
یہ دمکتے ہُوئے رُخسار رہیں گے کب تک

گاؤ تکیے سے لپٹتے ہُوئے دو بچّوں نے
اپنی ماؤں کو، کبھی رقصِ جنُوں کو دیکھا
سازِ ویراں کو، کبھی سوزِ دُروں کو دیکھا

لوریاں دے کے سُلائیں گی یہ مائیں کہ نہیں
چُوم کر صُبح اُٹھائیں گی یہ مائیں کہ نہیں
جاگ کر ہم کو سُلائیں گی یہ مائیں کہ نہیں

دِیوانوں پہ کیا گُذری

صِرف دو چار برس قبل یُونہیں بر سرِ راہ
مِل گیا ہوتا اگر کوئی اِشارا ہم کو
کِسی خاموش تکلّم کا سہارا ہم کو
یہی دُزدیدہ تبسّم، یہی چہرے کی پُکار
یہی وعدہ، یہی ایما، یہی مُبہم اِقرار

ہم اِسے عرش کی سرحد سے مِلانے چلتے
پھُول کھتے کبھی سنگیت بنانے چلتے
خانقاہوں کی طرف دیپ جلانے چلتے

صِرف دو چار برس قبل! مگر اب یہ ہے
کہ تِری نرم نِگاہی کا اِشارا پا کر
کبھی بِستر کبھی کمرے کا خیال آتا ہے

زِندگی جِسم کی خواہش کے سوا کچُھ بھی نہیں
خُون میں خُون کی گردش کے سوا کچُھ بھی نہیں

گُناہ گار

اَے سوگوار یاد بھی ہے تجُھ کو یا نہیں
وُہ رات جب حیات کی زُلفیں دراز تھیں
جب روشنی کے نرم کنول تھے بُجھے بُجھے
جب ساعتِ ابد کی لَویں نیم باز تھیں
جب ساری زندگی کی عبادت گذاریاں
تیری گُناہ گار نظر کا جواز تھیں

اِک ڈُوبتے ہُوئے نے کِسی کو بچا لیا
اِک تیرہ زندگی نے کِسی کو نگاہ دی
ہر لمحہ اپنی آگ میں جلنے کے باوجُود
ہر لمحہ زمہریرِ محبّت کو راہ دی
ہم نے تو تجھ سے دُور کی ہمدردیاں دکھائیں
تُو نے کِسی سے رسمِ وفا بھی نباہ دی

مُدّتوں کور نگاہی دِل کی
نُورِ عرفاں کو ترستی رہتی
تو جو خورشید نہ بن کر آتی
ذہن پر اوس برستی رہتی

کیا خبر آج تیری پلکوں میں
برہمی ہے کہ غم کا سوز و گداز
میرے سینے سے اب بھی آتی ہے
تیری پلکوں کی رحمِ دل آواز

اللہ اللہ یہ لرزشِ مژگاں
جھٹپٹے کا ہے طرفہ راز و نیاز
راگنی میں ڈھلا ہوا گویا
رات کو گھومتے کرے کا گداز

مجھ کو چپ چاپ اس طرح مت دیکھ
میرے بستر کی سلوٹیں مت کھول
رات میں کتنی دیر سویا ہوں
بول اے صبح کے ستارے بول

اُس کو کرنوں نے دی ہے تابانی
اُس کو مہتاب نے سنوارا ہے
یوں وہ عورت ضرور ہے لیکن
اُس کی بنیاد اِستعارا ہے

یوں تو اکثر خیال آتا تھا
میں جو ہوں اُس سے پارسا بن جاؤں
تیری آنکھوں کو دیکھنے کے بعد
مَیں نے چاہا کہ مَیں خدا بن جاؤں

سُن کے لوگوں کے زہر سے فِقرے
دیکھ کر اپنے گھر کی بربادی
مَیں بھی جب مسکرا ہی لیتا ہوں
تم تو کتنا بدل گئی ہو گی!

صرف کہہ دُوں کہ ناؤ ڈُوب گئی
یا بتاؤں کہ کیسے ڈُوبی تھی
تم کہانی تو خیر سُن لو گی
آپ بیتی کہُوں کہ جگ بیتی

کوئی ساغر کی سمت گرمِ فرار
کوئی جسموں میں ڈھونڈتا ہے سکوں
مجھ کو بھی مل گئی ہے جائے پناہ
شعر لکھتا ہُوں اور جیتا ہُوں

وقت کے ساتھ لوگ کہتے تھے
زخمِ دل بھی تمھارے ہوں گے دُور
رفتہ رفتہ یہ وقت آ پہنچا
میرا ہر زخم بن گیا ناسُور

فرار

اِس سے پہلے کہ خرابات کا دروازہ گرے

رقص تھم جائے، اداؤں کے خزانے لُٹ جائیں
وقت کا درد، نگاہوں کی تھکن، ذہن کا بوجھ
نغمہ و ساغر و اِلہام کا رُتبہ پا لے
کونپلیں دُھوپ سے اِک قطرۂ شبنم مانگیں
سنگساری کا سزاوار ہو بلّور کا جسم
دِل کے اُجڑے ہُوئے مندر میں وفا کی مشعل
مَصلِحت کیشیٔ طوفان کی زد میں آجائے
آہوئے دشتِ جنُوں شہر کی حد میں آجائے

سب کے قدموں میں تمنّا پئے خمیازہ گرے

عاقلو، دیدہ ورو، دُوسری راہیں ڈھونڈو
اِس سے پہلے کہ خرابات کا دروازہ گرے

محبّت

تُو مِری شمعِ دِل و دِیدہ، مِری معصومہ
پیار کی دُھوپ میں نِکلی تو پِگھل جائے گی
کھولتا، گونجتا لاوا ہے مِرے جِسم کا لمس
تُو مِرے ہونٹوں کو چُھو لے گی تو جل جائے گی

تِتلیاں چُن ابھی خاروں کی طلبگار نہ بن
لوریاں سِیکھ مِرے درد میں غم خوار نہ بن
بزمِ آہنگ میں آ، نالۂ خُونبار نہ بن

میرا دِل وقت کے طُوفان میں ہے ایسی چٹان
کہ سفینہ اِدھر آیا تو بِکھر جائے گا
ابدی نِیند کا پیغام ہے میرا آغوش
جو مِری گود میں آئے گا وُہ مر جائے گا

خزانہ

رات کے خواب جلے دِن کی تمازت سے مگر
تو مِرے واسطے فردوسِ گُماں آج بھی ہے

وُہی ہر سمت ترے نام کی دیواریں ہیں
وُہی آفاق کی محدُود عناں آج بھی ہے

وُہی تابندہ درخشاں ہے ترے رُوپ کی لَو
وُہی حالات کا سیلابِ رواں آج بھی ہے

سیکڑوں جِسموں سے کھیلی ہے جوانی میری
دِل میں تقدیس و طہارت کا سماں آج بھی ہے

دُوسرے بُت کدے روشن بھی ہُوئے، بُجھ بھی گئے
تیری مسجِد میں وُہی سوزِ اذاں آج بھی ہے

اُن گناہوں میں جَلا ہُوں کہ مِرے سینے میں
خُوشبُوئے عِصمتِ مریم بَدناں آج بھی ہے

غم تو مے خانے کی تاریک گلی تک لایا
ذہن میں سلسلۂ کاہکشاں آج بھی ہے

کوہساروں کی طرح ساکت و بے جان ہے وقت
آبشاروں کی طرحِ طبع رواں آج بھی ہے

تنگیِ دائرۂ اہلِ خرد کے باوصف
وُسعتِ حلقۂ آشفتہ سراں آج بھی ہے

ساری سڑکوں پہ اجارہ ہے ہُنرمندوں کا
موڑ پر عشق کی چھوٹی سی دُکاں آج بھی ہے

آندھیاں تیز ہیں اور طاقِ الفْ لیلیٰ میں
اِک چراغِ تہہ داماں کا دُھواں آج بھی ہے

اب کہاں قافلۂ کاکل و رُخسار مگر
دیدۂ شوق بہر سو نگراں آج بھی ہے

○ صحیح الفْ ہے: اُردو میں عام طور پر الِف پڑھتے ہیں

اُنگلیاں ٹوٹ رہی ہیں تجھے چھونے کے لئے
بے حِنا ہاتوں کا لُطفِ گُذَراں آج بھی ہے

کُشتۂ تشنہ لبی ہُوں، مگر اِن ہونٹوں میں
بُوئے شاداب مسیحا نفساں آج بھی ہے

اَب نہ تپتی ہُوئی باتیں نہ سُلگتے ہُوئے خط
گرم آتش کدۂ حرف و بیاں آج بھی ہے

ایک اِک زخم پہ محفُوظ ہیں تیروں کے نگار
مُسکراتی ہُوئی ابرُو کی کماں آج بھی ہے

بازوؤں میں تِری آہُو بدَنی باقی ہے
کروٹوں میں تِری وحشت کا نشاں آج بھی ہے

آج کل کون وفادار ہُوا کرتا ہے
خود پہ نازاں ہوں کہ یہ جِنس گراں آج بھی ہے

ہار جیت

میری بن جانے پہ آمادہ ہے وُہ جانِ حیات
جو کسی اَور سے پیمانِ وفا رکھتی ہے
میرے آغوش میں آنے کے لئے راضی ہے
جو کسی اَور کو سینے میں چھپا رکھتی ہے

شاعری ہی نہیں کچھ باعثِ عزّت مجھ کو
اَور بہت کچھ حسد و رشک کے اسباب میں ہے
مجھ کو حاصل ہے وُہ معیارِ شب و روز کہ جو
اُس کے محبوب کے ہاتوں میں نہیں خواب میں ہے

کون جیتے گا یہ بازی مجھے معلوم نہیں
زندگی میں مجھے کیا اَور اُسے کیا مل جائے
کاش وُہ زینتِ آغوش کسی کی بن جائے
اَور مجھے گرمئ پیمانِ وفا مل جائے

فسادِ ذات

دریدہ پیرہنی کل بھی تھی اور آج بھی ہے
مگر وہ اور سبب تھا — یہ اور قصّہ ہے
یہ رات اور ہے، وہ رات اور تھی، جس میں
ہر ایک اشک میں سارنگیاں سی بجتی تھیں
عجیب لذّتِ نظّارہ تھی حجاب کے ساتھ
ہر ایک زخم مہکتا تھا ماہتاب کے ساتھ
یہی حیاتِ گریزاں بڑی سہانی تھی
نہ تم سے رنج نہ اپنے سے بدگمانی تھی

شکایت آج بھی تم سے نہیں کہ محرومی
تمھارے در سے نہ ملتی تو گھر سے مل جاتی

تمُھارا عہد اگر اُستوار ہی ہوتا
تو پھر بھی دامنِ دل تار تار ہی ہوتا
خُود اپنی ذات ہی ناخُن خُود اپنی ذات ہی زخم
خُود اپنا دِل رگِ جاں اور خُود اپنا دِل نشتر
فسادِ خلق بھی خُود اور فسادِ ذات بھی خُود
سفر کا وقت بھی خُود جنگلوں کی رات بھی خُود

تمُھاری سنگ دِلی سے خفا نہیں ہوتے
کہ ہم سے اپنے ہی وعدے وفا نہیں ہوتے

اِسی گھر میں

بیٹھا ہُوں سیہ بخت و مُکدّر اِسی گھر میں
اُترا تھا مرا ماہِ منوّر اِسی گھر میں

آے سانس کی خوشبو لب و عارض کے پسینے
کھولا تھا مرے دوست نے بستر اِسی گھر میں

چٹکی تھیں اِسی صحن میں اُس ہونٹ کی کلیاں
مہکے تھے وُہ اوقاتِ میسّر اِسی گھر میں

افسانہ در افسانہ تھا مُڑتا ہُوا زینہ
آئینہ در آئینہ تھا ہر در اِسی گھر میں

ہوتی تھی حریفانہ بھی ہر بات پہ اِک بات
رہتی تھی رقیبانہ بھی اکثر اِسی گھر میں

شرمندہ ہُوا تھا یہیں پندارِ امارت
چمکا تھا فقیروں کا مُقدر اِسی گھر میں

سوئی تھی یہیں تھک کے بلائے شبِ ہجراں
جاگی تھی کوئی زُلفِ مُعنبر اِسی گھر میں

اِک زمزمہ رفتار کے قدموں کی بدولت
چھلکا تھا کبھی چشمۂ کوثر اِسی گھر میں

وُہ جس کے درِ ناز پہ جُھکتا ہے دو عالم
آئی تھی بڑی دُور سے چل کر اِسی گھر میں

وُہ اَجنبی

وُہ مہر و ماہ و مُشتری کا ہم عناں کہاں گیا
وُہ اجنبی کہ تھا مکان و لامکاں کہاں گیا

ترس رہا ہے دِل کسی کی داوری کے واسطے
پیمبرانِ نیم جاں خُدائے جاں کہاں گیا

وُہ مُلتفت بہ خندہ ہائے غیر کس طرف ہے آج
وُہ بے نیازِ گریہ ہائے دوستاں کہاں گیا

وُہ ابر و برق و باد کا جلیس ہے کِدھر نہاں
وُہ عرش و فرش و ماورا کا رازداں کہاں گیا

وُہ میزباں کہاں ہے جس کی دید بھی محال تھی
جو آج تک نہ آ سکا وُہ میہماں کہاں گیا

بُجھی پڑی ہے ماہتاب و کہکشاں کی انجمن
وُہ صدرِ بزمِ ماہتاب و کہکشاں کہاں گیا

یہ کائناتِ آب و گِل ہے جس کے غم میں مُضمحل
دِیا ہے جس نے سوزِ دِل وُہ مہرباں کہاں گیا

ترس رہے ہیں دُور دُور تک اُداس راستے
مُسافرو بتاؤ میرِ کارواں کہاں گیا

اعتراف

ترے کرم نے مجھے کر لیا قبول مگر
مِرے جنوں سے محبت کا حق ادا نہ ہُوا

ترے غموں نے مِرے ہر نشاط کو سمجھا
مِرا نشاط ترے غم سے آشنا نہ ہُوا

کہاں کہاں نہ مِرے پاؤں لڑکھڑائے مگر
ترا ثبات عجب تھا کہ حادثہ نہ ہُوا

ہزار دشنہ و خنجر تھے میرے لہجے میں
تِری زباں پہ کبھی حرفِ ناروا نہ ہُوا

تِرا کرم جو گھٹا بھی تو بے پناہ رہا
مِرا سلوک بڑھا بھی تو مُنصفانہ ہُوا

تِرے دُکھوں نے پُکارا تو مَیں قریب نہ تھا
مِرے غموں نے صدا دی تو فاصلہ نہ ہُوا

تِرے مجاز میں اُس کے لئے پرستش تھی
خُدا کا نام لئے جِس کو اِک زمانہ ہُوا

ہزار شمعوں کا بنتا رہا مَیں پروانہ
کِسی کا گھر، تِرے دل میں، مِرے سِوا نہ ہُوا

مِری سیاہیٔ دامن کو دیکھنے پر بھی
تِرے سفید دوپٹوں کا دِل بُرا نہ ہُوا

خزَف کی جیب میں کیا تھا سِوائے گُمنامی
بس ایک گوہرِ نایاب سے خزانہ ہُوا

تو مری شمعِ دِل و دِیدہ

وُہ کوئی رقص کا انداز ہو یا گیت کی تان
میرے دِل میں تری آواز اُبھر آتی ہے
تیرے ہی بال بکھر جاتے ہیں دیواروں پر
تیری ہی شکل کتابوں میں نظر آتی ہے

شہر ہے یا کسی عیّار کا پُر ہَول طلِسم
تُو ہے یا شہرِ طلِسمات کی ننھّی سی پری
ہر طرف سیلِ رواں، بس کا دھوّاں، ریل کا شور
ہر طرف تیرا خُنک گام، تِری جلوہ گری

ایک اک رگ تری آہٹ کے لئے چشم براہ
جیسے تُو آئے گی بس کوئی گھڑی جاتی ہے
تیری پرچھائیں ہے یا تُو ہے مرے کمرے میں
بلب کی تیز چمک ماند پڑی جاتی ہے

ٹینک سڑکوں پہ چلیں جیپ کے آگے پیچھے
دِن گذرتا ہے ترا سایۂ ابرُو لے کر
فلسفے تند حقائق کی شعاعیں ڈالیں
شام آتی ہے تِری آنکھ کا جادُو لے کر
میں اِسی گیس کی دُنیا میں تعفّن کے قریب
شعر لِکھتا ہُوں ترے جِسم کی خُوشبو لے کر

نذرِ حنا

نغمہ و رنگ مِرے حلقۂ ماتم میں نہ آ
صُبحِ فردوس مِری شامِ جہنّم میں نہ آ
میرے سینے میں گناہوں کی فراوانی ہے
دشت کی دُھوپ ہے، طُوفان کی طُغیانی ہے
خارِ بے مایہ کی تکریم بڑھا دی مَیں نے
لذّتِ زخم کو ہر بار دُعا دی مَیں نے
آگ کے واسطے کوثر کا سبُو توڑ دیا
رِشتۂ دامنِ جبریلِ امیں چھوڑ دیا
اپنا گھر پھُونک دیا قریۂ ویراں کے لئے
دل لہُو کر لیا ہر رنگ کے پیکاں کے لئے
مشقِ ماتم کے لئے زمزمہ خوانی کھو دی
دشت کے واسطے دریا کی روانی کھو دی
چاکِ پیراہنِ دِل چاک رہا اَور نہ سِیا
عقل کو دانۂ گندم کے عوض بیچ دِیا

چھوڑ کر اپنا بھرم ملّتِ اسلامی میں
رات بھر جشن کیا کُوچۂ بدنامی میں
نہ دُعائیں نہ حکایاتِ ذُوالاکرام رہیں
لب و رُخسار کی گلیاں سحر و شام رہیں

پھر نہ اس معصیتِ دل میں جلا شمعِ ظہُور
میری انجیلِ تمنّا مری تفسیرِ زبُور
پھر نہ وُہ درد اُٹھا جو غمِ ادراک میں ہے
پھر نہ اُس چوٹ کو اُکسا جو رگِ خاک میں ہے
تُو جو آتی ہے اندھیرے میں شبستاں بن کر
دیر تک زخم لہکتے ہیں بہاراں بن کر
مُنھ سے کچھ بھی نہیں کہتی ہیں نگاہیں تیری
برچھیاں بن کے اُتر جاتی ہیں آہیں تیری
ایک اک خُون کا قطرہ نگراں ہوتا ہے
ایک اک لمحہ ملامت کی زباں ہوتا ہے

لَوٹ جا، رُوحِ وفا، جسم نہ پالے تجھ کو
میرے جنگل کی گھنی رات نہ آلے تجھ کو
کہیں تُو بھی نہ مرے ساتھ فنا ہو جائے
یہ لہُو بھی نہ کہیں نذرِ حنا ہو جائے

ایک عصرانہ

جانِ محفل، ترا اندازِ سُخن جو کُچھ ہو
تیری اُفتاد، ترے دِل کی لگن جو کُچھ ہو
تجھ کو آتا ہو ستاروں سے کنایہ کرنا
تُو نے سیکھا ہو خُداؤں کو رعایا کرنا
لفظ کی اوٹ میں کھُلتے ہوں معانی کیا کیا
بات بنتی ہو اِشاروں کی زبانی کیا کیا

آج ٹُوٹا یہ طلسمِ لب و سحرِ امکاں
جب تری جُنبشِ ابرُو سے نہ چٹکیں کلیاں
تُو نے تسخیر و تعلّق کے لئے کیا نہ کیا
اُس نے اِظہار تو کیا، وہمِ تمنّا نہ کیا
اَے کہ تُو شمعِ سرِ طُور ہے کاشانوں میں
نام بھی اُس نے نہ پُوچھا ترا مہمانوں میں

سہرا

یارو شہیدِ رسمِ جفا ہم ہُوئے کہ تُم
اپنی سلامتی سے خفا ہم ہُوئے کہ تُم
ہم پر ہنسے گا جو بھی سُنے گا یہ واردات
رُسوا سرِ سمُوم و صبا ہم ہُوئے کہ تُم
مانا کہ وُہ ہمارے مُقدّر سے دُور ہے
اُس کے لئے دُعا ہی دُعا ہم ہُوئے کہ تُم
مانا کہ ہم پہ اُس کی محبّت حرام ہے
چُپ چاپ کُشتگانِ وفا ہم ہُوئے کہ تُم
ہم اُس ہوا کو چُوم رہے ہیں جہاں وُہ تھی
بیعت کُنانِ دستِ صبا ہم ہُوئے کہ تُم
مشرق کے ہر رواج کی قربان گاہ پر
ہمراہیانِ صد شہدا ہم ہُوئے کہ تُم
جِس کی خموشیوں میں حکایت کا سوز تھا
اُس کی حکایتوں کی بِنا ہم ہُوئے کہ تُم

ہے اُس کے چشم و رُخ کی ضیا غیر کے لئے
ہاں اُس کے چشم و رُخ کی حیا ہم ہُوئے کہ تُم

اُن انکھڑیوں میں شرم کے ڈورے کہاں سے آئے
اُن اُنگلیوں پہ رنگِ حنا ہم ہُوئے کہ تُم

لکھا ہو مِل کے سارے سِتاروں نے جس کا نام
اُس کہکشاں پہ آبلہ پا ہم ہُوئے کہ تُم

اِس عقل و فہم و عمر و فراست کے باوجود
ذہنِ رقیب و دستِ گدا ہم ہُوئے کہ تُم

ہم لوگ

آؤ اُس یاد کو سینے سے لگا کر سو جائیں
آؤ سوچیں کہ بس اک ہم ہی نہیں تیرہ نصیب
اپنے ایسے کئی آشفتہ جگر اور بھی ہیں

ایک بے نام تھکن، ایک پُر اسرار کسک
دِل پہ وُہ بوجھ کہ بھُولے سے بھی پُوچھے جو کوئی
آنکھ سے جلتی ہُوئی رُوح کا لاوا بہہ جائے

چارہ سازی کے ہر انداز کا گہرا نشتر
غم گُساری کی روایات میں اُلجھے ہُوئے زخم
دردمندی کی خراشیں جو مٹائے نہ مِٹیں

اپنے ایسے کئی آشفتہ جگر اور بھی ہیں
لیکن اَے وقت وُہ صاحب نظراں کیسے ہیں
کوئی اُس دیس کا مِل جائے تو اِتنا پُوچھیں
آج کل اپنے مسیحا نفساں کیسے ہیں
آندھیاں تو یہ سُنا ہے کہ اُدھر بھی آئیں
کونپلیں کیسی ہیں، شیشوں کے مکاں کیسے ہیں؟

رفتگاں

زمانہ ختم ہو گیا
لہو میں تھا جو رقصِ والہانہ ختم ہو گیا

گرج برس کے بادلوں کے قافلے گُذر گئے
وُہ منزلیں گُذر گئیں، وُہ فاصلے گُذر گئے
زمیں سے آسماں تک اِک طلسم اِک فسانہ تھا
فسانہ ختم ہو گیا

تمام رات مُشتری کی انجُمن سجی رہی
فضا میں دُور دُور اشرفی کے ڈھیر لگ گئے
سحر ہُوئی تو چاند کا خزانہ ختم ہو گیا

سکُوتِ حال میں نِشاطِ آرزُو، نہ دھڑکنیں
سرودِ رفتہ میں غمِ شبانہ ختم ہو گیا
نیازِ حسُن و سوزِ عاشقانہ ختم ہو گیا
روایتوں کا ربطِ غائبانہ ختم ہو گیا

سودا

وُہ تو کیا، سب کے لئے فیصلہ دُشوار نہیں
اِک طرف برف کے ڈھیر، ایک طرف شعلۂ طُور
اِک طرف ساعتِ شب، ایک طرف صُبحِ نوید
اِک طرف آگ کی رَو، ایک طرف حُور و قصُور
اِک طرف لذّتِ ہر رنگ سو وُہ بھی فوراً
اِک طرف وعدۂ فردا سو وُہ نزدیک نہ دُور

اُس کے اِس طرزِ تغافل کی شکایت تو نہیں
ہاں مگر اُس سے یہ ادنیٰ سی گذارش ہے ضرور
اِک چُرائے ہُوئے ناپاک تبسّم کے عوض
اُس نے بیچا ہے سُلگتے ہُوئے اشکوں کا غرُور

اندوہِ وفا

آج وُہ آخری تصویر جلا دی ہم نے
جس سے اُس شہر کے پھُولوں کی مہک آتی تھی
آج وُہ نکہتِ آسُودہ لُٹا دی ہم نے
عقل جس قصر میں اِنصاف کیا کرتی ہے
آج اُس قصر کی زنجیر ہِلا دی ہم نے

آگ کاغذ کے چمکتے ہُوئے سینے پہ بڑھی
خواب کی لہریں بہتے ہُوئے آئے ساحل
مُسکراتے ہُوئے ہونٹوں کا سُلگتا ہُوا کرب
گُنگناتے ہُوئے عارض کا دہکتا ہُوا تِل
جگمگاتے ہُوئے آویزوں کی مُبہم فریاد
سرسراتے ہُوئے لمحوں کے دھڑکتے ہُوئے دِل

ایک دِن رُوح کا ہر تار صدا دیتا تھا
کاش ہم بِک کے بھی اِس جنسِ گراں کو پالیں
قرضِ جاں دے کے متاعِ گُذراں کو پالیں
خُود بھی کھو جائیں پر اِس رمزِ نہاں کو پالیں

اور اب یاد کے اِس آخری پیکر کا طِلسم
قِصّۂ رفتہ بنا، خواب کی باتوں سے ہُوا
اُس کا پیار، اُس کا بدن، اُس کا مہکتا ہُوا رُوپ
آگ کی نذر ہُوا اور اِنھیں ہاتوں سے ہُوا

وصال

وُہ نہیں تھی تو دِل اِک شہرِ وفا تھا، جس میں
اُس کے ہونٹوں کے تصوّر سے تپش آتی تھی
اُس کے اِنکار پہ بھی پھُول کھِلے رہتے تھے
اُس کے انفاس سے بھی شمع جلی جاتی تھی

دِن اِس اُمّید پہ کٹتا تھا کہ دن ڈھلتے ہی
اُس نے کچھ دیر کو مِل لینے کی مُہلت دی ہے
اُنگلیاں برق زدہ رہتی تھیں، جیسے اُس نے
اپنے رُخساروں کو چھُونے کی اِجازت دی ہے

اُس سے اِک لمحہ الگ رہ کے جنُوں ہوتا تھا
جی میں تھی اُس کو نہ پائیں گے تو مر جائیں گے
وُہ نہ ہوگی تو دَرک جائے گا پیمانۂ ماہ
تیرگی میں کیسے ڈھونڈیں گے، کدھر جائیں گے

پھر ہُوا یہ کہ لپکتے ہُوئے انگاروں میں
ہم تو جلتے تھے مگر اُس کا نشیمن بھی جلا
بجلیاں جس کی کنیزوں میں رہا کرتی تھیں
دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وُہ خرمن بھی جلا
اس میں اِک یُوسفِ گُم گشتہ کے ہاتوں کے سِوا
اِک زلیخائے خُود آگاہ کا دامن بھی جلا

فراق

ہم نے جس طرح سبُو توڑا ہے ___ ہم جانتے ہیں
دلِ پُرخوں کی مئے ناب کا قطرہ قطرہ
جُوئے الماس تھا، دریائے شبِ نیساں تھا
ایک اک بُوند کے دامن میں تھی موجِ کوثر
ایک اک عکس حدیثِ حرمِ ایماں تھا
ایک ہی راہ پہنچتی تھی تجلّی کے حضور
ہم نے اُس راہ سے مُنھ موڑا ہے ___ ہم جانتے ہیں

ماہ پاروں کے طلسمات میں تیرا افسوں
شیوہ و شعبدہ و رسم و روایات میں تُو
حرف و تقریر میں تُو، رمز و کنایات میں تُو
خواب کی بزم تری، دیدۂ بے خواب ترا
صُبح کے نُور میں تُو، نیند بھری رات میں تُو
دل کی دھڑکن کا ترے قُرب کے لمحوں پہ مدار
ہم نے جس طرح تجھے چھوڑا ہے ___ ہم جانتے ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کوہِ ندا

کوہِ ندا

مصطفیٰ زیدی

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی) ۔ لیک روڈ۔ لاہور

فہرست

نظمیں اور غزلیں

باقیات

مصطفیٰ زیدی

(ایک تعارف)

سید مصطفیٰ احسنین نام، زیدی تخلص، ابتداً تیغ الہ آبادی کے تخلص سے شہرت پائی۔
۱۰ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی نہایت ذہین، طبّاع اور مطالعے کے گرویدہ تھے۔ میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ برّصغیر پاک و ہند میں یہ زمانہ سیاسی، ادبی اور تہذیبی اعتبار سے زبردست ہیجان اور جوش و خروش کا تھا۔ مصطفیٰ زیدی نے ان حالات سے شدت سے اثر قبول کیا اور اوائل طالب علمی میں ہی باقاعدہ شاعری کرنے لگے۔ جوشؔ کے لہجے کی گھن گرج ان کے ابتدائی کلام پر حاوی تھی۔ تیغ کا تخلص اسی دَور کی یادگار تھا۔ کچھ عرصے فراقؔ گورکھپوری سے مشورۂ سخن کرتے رہے، لیکن ان کی شاعری کا انفرادی رنگ بتدریج نمایاں ہوتا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۵۰ء میں بی اے کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کیے۔ ایم اے پریویس کرنے کے بعد پاکستان آ گئے اور ایم اے انگریزی کا امتحان ۱۹۵۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا۔

مصطفیٰ زیدی ابتداً اسلامیہ کالج کراچی اور اس کے بعد پشاور یونیورسٹی میں انگریزی کے اُستاد رہے۔ ۱۹۵۴ء میں سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں انگلستان سے تربیت حاصل کرنے کے بعد تمام یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کا سفر کیا اور پندرہ ملکوں کے ستّر ہزار میل کی مسافت طے کر کے پاکستان واپس ہوئے پہلے سیالکوٹ اور بعد میں ڈیرہ غازی خاں اور مری میں اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر تعینات رہے۔ کچھ

عرصہ لاہور میں ڈپٹی سیکرٹری تعلیمات کے طور پر گزارا۔ پھر جہلم میں ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے نواب شاہ، خیرپور، خانیوال اور ساہیوال کے بعد لاہور میں ڈپٹی کمشنر رہے۔ حکومت پاکستان نے اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں تمغۂ قائدِ اعظم عطا کیا۔ ۱۹۶۸ء میں نیفلڈ اسکالرشپ پر مزید تربیت کے لیے لندن گئے۔ واپسی میں امریکہ، جزائر ہوائی، فلپائن، ویت نام اور سنگاپور کی سیاحت کرتے ہوئے پاکستان پہنچے اور ۱۹۶۹ء میں ڈپٹی سیکرٹری بنیادی جمہوریت مقرر ہوئے۔ یہ اُن کا آخری سرکاری منصب تھا۔ دسمبر ۱۹۶۹ء میں ملازمت سے معطّل اور مئی ۱۹۷۰ء میں برطرف کر دیے گئے۔ ۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو سیالکوٹ میں مصطفےٰ زیدی نے ویرا فان ہل سے شادی کی۔ ویرا زیدی جرمن نژاد ہیں، لیکن اُنھوں نے اُردو زبان، ادب اور پاکستان کی معاشرت کو اس طرح اختیار کیا کہ ان کی وضع اور لب و لہجہ پر غیر ملکی ہونے کا گمان تک نہیں گزرتا۔ ان کے یہاں ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۰ء میں پہلے بیٹا اور پھر بیٹی پیدا ہوئی۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو کراچی میں مصطفےٰ زیدی کی اچانک موت کا سانحہ رونما ہوا۔ اس طرح دُنیائے ادب اپنے ایک نہایت ذہین اور خوش فکر شاعر سے اور عزیزوں، دوستوں اور شناساؤں کا ایک وسیع حلقہ، ایک مخلص اور درد مند شخصیت کی رفاقت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔

مصطفےٰ زیدی ایک صاف گو، بیباک، متواضع اور خلیق انسان تھے۔ اُردو اور انگریزی ادبیات پر اُن کی گہری نظر تھی۔ چالیس سال کی مختصر عمر میں ان کے چھ شعری مجموعے مرتب ہو کر شائع ہوئے۔ ان کی ترتیبِ اشاعت یہ ہے۔

(۱) زنجیریں، ۱۹۴۹ء (۲) روشنی ۱۹۵۰ء (۳) شہر آذر ۱۹۵۸ء

(۴) موج مری صدف صدف ۱۹۶۰ء (۵) گریبان ۱۹۶۴ء (۶) قبائے ساز ۱۹۶۷ء

حرفِ آخر

کوہِ ندا میری نظموں کا آخری مجموعہ ہے - اس استغنا کی وجہ میرا چھوٹا پن ہے۔
میرے چھوٹے پن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے -

(۱) شعر محض ذاتی، اندرونی اور جذباتی واردات کی تفسیر نہیں ہوتا - ہو بھی تو اس ذاتِ اندرون پر تحقیق، کسبِ علم، بالخصوص سائنسی اور فلسفیانہ علم کی اتنی آنچ پڑ چکی ہونی چاہیے کہ ہر جذبہ تربیت یافتہ ہو گیا ہو اور ہر وجدانی کیفیت مجذوب کی بڑ اور دیوانگی سے نمایاں طور پر مختلف معلوم ہو -

(۲) مدّت ہوئی کہ میں اس شوقِ تجسّس سے "بوجوہ" بیگانہ ہوتا چلا گیا ہوں۔ پچھلے کئی برسوں میں اگر میں نے کوئی مطالعہ بالاستیعاب کیا ہے تو وہ دنیا بھر کی پورنوگرافی کا ہے - اب سال بھر سے اس نوع کی کتابیں پڑھنے سے بھی طبیعت اُکتا گئی ہے -

ایک پڑھے لکھے دوست، اطہر صاحب نے جو بی بی سی (لندن) کے مشرقی نشریہ سے وابستہ ہیں - ۱۹۶۸ء میں لندن میں اچھی کتابیں پڑھنے کی جستجو دوبارہ میرے اندر پیدا کر دی تھی - حالاتِ زمانہ نے اس جستجو کو قائم رکھنے کی اجازت ہی نہیں دی -
اپنی کم علمیّت، بلکہ جہالت کے باوجود جس ملک میں رہتا ہوں وہاں میں پڑھا

کم سمجھا جاتا ہوں اور جن لوگوں سے ملا جلا ہوں اُن میں سے مَیں نے اکثریت کو اپنے سے بھی زیادہ بے مایہ پایا ہے۔

(ب) اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ دُنیا کا متمدّن حصّہ جس بلند شاعری کا طالب ہے وہ میرے بس میں نہیں اور میرا اپنا ملک جس قسم کی شاعری کا عادی ہے وہ بھی میرے بس میں نہیں۔

(۲) (RECOGNITION) کے بغیر ہمیشہ ہمیشہ شعر کہتے رہنا ناممکن ہے۔ مَیں نے کئی ایسے شعراء سے زیادہ اچھے شعر کہے ہیں جنھیں ناقدوں نے RECOGNISE کیا ہے۔ یقیناً میری ذات یا میرے شعر یا دونوں میں کوئی ایسا عیب ہے جو اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ دس پندرہ سال تک جھک مارنے کے بعد جب مَیں نے وزیر آغا کی نئی شاعری پر ایک دبیز کتاب دیکھی، جس میں چھوٹے سے چھوٹے شاعر کا ذکر تھا لیکن میرا نام تک نہیں تھا تو میرا دل ٹوٹ گیا۔ فیروز سنز نے بھی اس نوعیت کی جو کتابیں شائع کی ہیں ان میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ جب دس پندرہ سال کی شاعرانہ یادہ پیمائی کا یہ نتیجہ ہے تو آئندہ کس کے لیے شعر کہے جائیں اور ان کی کیا ضرورت ہے۔

(ب) مَیں شاعری اور سرکاری ملازمت دونوں میں MISFIT ہوں۔ جن لوگوں میں ملنے جلنے سے شاعر حلقۂ شعراء میں قابلِ قبول ہوتا ہے اُن کو میں کبھی ملا ہی نہیں۔ یا ملا تو رسماً، اسی طرح سول سروس آف پاکستان میں مشکل سے میرے دو یا تین رفیق ہیں۔ اس طرح تارکُ الدُّنیا ہو کر رہنے میں سراسر قصور میرا ہے۔ کچھ دل میں یہ گمان بھی ہے کہ اکثر شعراء مجھے اس لیے ملے ہیں کہ مَیں سرکاری افسر ہوں اور اکثر سرکاری افسر مجھے اس لیے ملے ہیں کہ ان کی ڈرائنگ روم کی نشستوں میں، میرا شاعر ہونا ان کے تفننِ طبع کا باعث ہے۔

(۳) میرے ملک کے معاشرے میں اپنے جامد نظریے کے علاوہ کسی اور نظریے کو قبول کرنا تو کیا برداشت کرنے تک کا ظرف نہیں ہے۔ جوش ملیح آبادی جیسے جیّد عالم اور کبیر شاعر یہاں حکومت اور عوام دونوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے رہے ہیں۔ مَیں اور میرے تمام ہم عصر اُن کے قدموں کی خاک بھی نہیں۔

(ب) لہٰذا جب معاشرہ ایک فرد کو قبول نہ کرے اور فرد اس معاشرے سے مصالحت پر آمادہ نہ ہو تو شعر لکھتے رہنا جیسی عبث اور فضول کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔

(ج) اور بالخصوص جب ملک کا مذہبی نظریہ کاٹ کھانے کو دوڑتا ہوا دکھائی دے تو خودکشی یا فرار کے سوا ایک ہی چارہ اور رہ جاتا ہے کہ قصائیوں کی چھریوں سے خود کو ذبح کرانے کے لیے ہر وقت تیار رہا جائے۔

(۴) مَیں نے شاعری کے علاوہ کئی روگ اور پالے، فوٹوگرافی شروع کی تو جنون کی حد تک، میرے سر پہ دُنیا کے ہزاروں شہروں کی دھوپ اور برف پڑی اور میں جلتی ہوئی یا ٹھٹھرتی ہوئی اُنگلیوں سے متحرک اور جامد کیمرہ چلاتا رہا۔ مُدّت تک میرا اپنا اسٹوڈیو اور ڈارک روم میرے گھر میں بند رہا۔ ۱۹۶۸ء میں جب مَیں لاہور واپس آیا اور بطور سیکرٹری حکومتِ مغربی پاکستان مجھے پوسٹنگ کے احکام ملے تو .... ایڈیشنل چیف سیکرٹری تھے۔ وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس رشتۂ عزیزیت میں اُنھوں نے مجھے ایک ایسا مکان الاٹ کیا جس میں باہر ملکوں کے سؤر بند رہنا پسند نہیں کریں گے۔ لہٰذا میری فوٹوگرافی کی عادت جو مجھے عزیز از جان تھی اس گھر کی نذر ہو گئی۔

(ب) اس گھر کا ذکر ایک اور اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس گھر کے الاٹمنٹ سے پہلے مجھے اور میرے بیوی بچّوں کو کئی ماہ تک بیچلرز ہاسٹل جی۔او۔آر (۳) میں سر چھپانے کی جگہ ملی تھی۔ یہاں ۲۴ اپریل ۶۹ء کی شام کو میرے

ایک ماتحت "افسرِ اعلیٰ" مجھے کئی ہزار روپے رشوت دینے آگئے۔ مَیں نے ان کی اس جرأت کے بارے میں اگلے دن چیف سیکرٹری کو تحریری اطلاع دی۔ یہ "افسرِ اعلیٰ" اتنے بارسوخ تھے اور صاحبانِ اقتدار میں اُن کی زبردست رسائی تھی کہ ان کا تو بال بھی بیکا نہیں ہوا اور میرا ایک ایک لمحہ عذاب بنا دیا گیا۔ کئی مہینوں کے ہر دن اور ہر رات مجھ پر اتنا ہراس اور خوف مسلّط کیا جاتا رہا کہ یہ ہر آدمی کی برداشت سے باہر ہے۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ مَیں نے حرام کے پیسے ٹھکرا دیے تھے۔

(ج) دوسرا جنون چھوٹے ہوائی جہازوں کو اُڑانے کا ہوا۔ پرائیویٹ پائیلٹ لائسنس بڑی مشقّت کے بعد ملا لیکن ایک ایسا اتفاق ہوا کہ اندھیرے میں ایک نامعلوم اور غیر محفوظ جگہ پر مجھے فورسڈ لینڈنگ کرنی پڑی، میں زندہ بچ گیا۔ لیکن تمام تر کوشش کے باوجود جہاز کو نقصان سے نہیں بچا سکا۔ جہاز مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز تھا۔ مجھے آج تک اس کا اتنا صدمہ ہے کہ فلائنگ کلب والے تک جن کا یہ طیارہ تھا اس صدمے کی گہرائی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

مصطفےٰ زیدی

۲؍دسمبر ۱۹۶۹ء

شامِ غزل

اصنافِ شعر میں میری طبیعت نظم پر مائل ہے۔ اسی لیے میرے دونوں مجموعوں "قبائے ساز" اور "شہرِ آذر" میں نظمیں زیادہ ہیں اور غزلیں کم۔ لیکن میں غزل کی نیم نگاہی کا نہ صرف قائل بلکہ گھائل ہوں۔ حد یہ ہے کہ مَیں نے جوشؔ ملیح آبادی جیسے کٹّر اور غزل سے متعصّب نظم گو کو غزلوں کا مجموعہ شائع کرنے پر آمادہ کر لیا ہے۔

آج کی غزلوں کے پس منظر کے بارے میں فرداً فرداً بیان کرنا ممکن نہیں۔ ہر غزل ایک آبشار کی طرح ہوتی ہے، جس کی ایک ایک بوند کا علیحدہ علیحدہ حساب نہیں ہو سکتا۔ جس طرح جھرنے پھوٹتے ہیں، شفق ترتیب ہوتی ہے اور تحلیل ہوتی ہے۔ جس طرح طلوع و غروب کے رنگ بنتے اور بکھرتے ہیں، اُسی طرح غزل کا

ایک ایک شعر تخلیق ہوتا ہے، اُبھرتا ہے اور غزل کے سنگیت میں گھُل مل جاتا ہے۔

البتہ اس سنگیت کے سُر، تال اور خیال کی نشاندہی میں اِس طور پر کر سکتا ہوں کہ غزلوں کے ساتھ ساتھ اپنے مزاج کے اجزائے ترکیبی، اپنے مسلک اور قدروں کی جان پہچان کا ذکر کرتا چلوں۔ جب دل و دماغ پر بیرونی محرکات اور اندرونی بحران کی ملی جلی پرچھائیاں پڑتی ہیں تو ان پرچھائیوں میں مجھے تمثیل اور استعارے کی واضح شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ اور ہر تجریدی خیال تنا سا نقش و نگار اور مانوس خدّ و خال لے کر سامنے آتا ہے۔ یہاں سے بیان اور اظہار کے عجز کا ایک کربناک سفر شروع ہوتا ہے اور بیشتر صورتیں اور سائے الفاظ کی قبا حاصل کیے بغیر اندھیرے میں گُم ہو جاتے ہیں۔ میں شعر سے ایسے اظہار کا طلب گار ہوں کہ خیال نہ صرف پڑھنے والے تک پہنچ سکے بلکہ پڑھنے والا اُسے انگلیوں سے چھُو کر محسوس کر سکے۔ اس کے لیے استعارے اور تشبیہہ کے علاوہ واضح امیجریز بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

مثلاً "جمال" مجھے اُس آگ کی طرح محسوس ہوتا ہے جو خود اپنی آنچ سے بے نیاز ہو لیکن جس کی ایک چھوٹی سی چنگاری ہوش و حواس کا دامن پھونک سکتی ہو۔ پھر اُس دامن کی وسعت دیکھیے جو سُلگنے کی اس کیفیت سے بچنے کی جگہ اس سے لُطف اندوز ہوتا ہو ؎

صہبائے تند و تیز کی حدّت کو کیا خبر
شیشے سے پوچھیے جو مزا ٹوٹنے میں تھا

کس کو دیکھا ہے کہ پندارِ نظر کے باوصف
ایک لمحے کے لیے رُک گئی دل کی دھڑکن

یکایک ایسے جل بجھنے میں لُطف جانکنی کب تھا
جلے اِک شمع پر ہم بھی مگر آہستہ آہستہ

روزمرّہ کے اَن گِنت واقعات ہمارے پندار کو مجروح اور ہماری اَنا کو فِگار کرتے رہتے ہیں۔ مَیں نے اپنی زندگی میں اس بات کی شعوری کوشش کی ہے کہ یہ جراحت میرے دل پر کوئی کاری نشان نہ چھوڑ جائے، لیکن اس عمل کے دوران جراحت کی ایک ایسی صورت پیدا ہو گئی جو خالص ذاتی اور وجدانی ہے اور جس کا تعلق بیرونی عوامل سے کم ہے ؂

آتشِ حُسن بھی تھی تابشِ دُنیا بھی مگر
شعلہ جس نے مجھے پھونکا مرے اندر سے اُٹھا

جنسِ ویرانیٔ صحرا مری دُکان میں ہے
کیا خریدے گا ترے شہر کا بازار مجھے

ایک بات اپنی غزل کے محبوب کے بارے میں کہنا چاہوں کہ اس کا پیکر شعری ورثے میں مجھے نہیں ملا۔ یہ پٹرول، ٹینک، کم و نری مختصر ملبوس، ایئرپورٹ، ریولان، کُسن اور تعلقاتِ عامہ کے زمانے کا محبوب ہے نہ مغل لباس پہنتا ہے نہ ہزار چلمنوں میں رہتا ہے۔

میرے اشعار میں ذرا اس کا شیوہ دیکھیے ؂

جب ہوا شب کو بدلتی ہوئی پہلو آئی
مدّتوں اپنے بدن سے تری خوشبو آئی

کیا کیا رہے ہیں حرف و حکایت کے سلسلے
وہ کم سخن نہیں تھا مگر دیکھنے میں تھا

اس کا رونا ہے کہ پیمان شکنی کے باوصف
وہ ستمگر اُسی پیشانیٔ خنداں سے ملا

غزل اپنے اور سارے زمانے کے دُکھ اور درد سمیٹنے کی جتنی صلاحیت رکھتی ہے وہ نظم کی صلاحیتوں سے کسی طرح کم نہیں۔ مَیں اس موقع پر اپنے ہم عصر شعراء کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں کہ اُن میں سے اکثر نے اس صلاحیت کو سمجھا اور اپنی

غزل میں جذبے اور فکر دونوں کو بصیرت کی لَو پر پگھلانے کی کوشش کی۔ ہم سب نے اپنی روایتوں کا احترام کیا ہے اور ہم سب نے ان روایتوں کے خلاف احتجاج کے علم بلند کیے ہیں۔ ہم سب کی نظر میں عصرِ جواں کی بغاوتوں کا غرور رہے اور ہم سب کے دلوں کے طاق میں شمعِ مُبیں جل رہی ہے۔

مصطفیٰ زیدی
ٹیلی ویژن لاہور
۱۹ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

ماہ و سال

اُسی روش پہ ہے قائم مزاجِ دیدۂ و دل
لہو میں اب بھی تڑپتی ہیں بجلیاں کہ نہیں
زمیں پہ اب بھی اُترتا ہے آسماں کہ نہیں؟

کسی کے جیب و گریباں کی آزمائش میں
کبھی خود اپنی قبا کا خیال آتا ہے
ذرا سا وسوسۂ ماہ و سال آتا ہے؟

کبھی یہ بات بھی سوچی کہ منتظر آنکھیں
غبارِ راہ گزر میں اُجڑ گئی ہوں گی
نظر سے ٹوٹ چکے ہوں گے خواب کے رشتے
وہ ماہتاب سی نیندیں بچھڑ گئی ہوں گی

نیازِ خواجگی و شانِ سروری کیا ہے
شعارِ مُشفقی و طرزِ دلبری کیا ہے
یہ بے رُخی، یہ ادائے ستم بھی پوچھیں گے
ہماری عُمر کے ہو لو تو ہم بھی پوچھیں گے

کراچی ۱۲/۱۱/۶۷

آخری بار مِلو

آخری بار مِلو ایسے کہ جلتے ہُوئے دل
راکھ ہو جائیں، کوئی اور تقاضہ نہ کریں
چاکِ وعدہ نہ سِلے، زخمِ تمنّا نہ کھِلے
سانس ہموار رہے، شمع کی لَو تک نہ ہِلے
باتیں بس اتنی کہ لمحے اُنھیں آکر گِن جائیں
آنکھ اُٹھائے کوئی اُمیّد تو آنکھیں چِھن جائیں

اُس ملاقات کا اِس بار کوئی وہم نہیں
جس سے اِک اور ملاقات کی صورت نکلے
اب نہ ہیجان و جُنوں کا نہ حکایات کا وقت
اب نہ تجدیدِ وفا کا نہ شکایات کا وقت

لُٹ گئی شہرِ حوادث میں متاعِ الفاظ
اب جو کہنا ہے تو کیسے کوئی نوحہ کہیے
آج تک تم سے رگِ جاں کے کئی رشتے تھے
کل سے جو ہوگا اُسے کون سا رشتہ کہیے

پھر نہ دیکھیں گے کبھی عارض و رخسار ملو
ماتمی ہیں دمِ رخصت در و دیوار، ملو
پھر نہ ہم ہوں گے، نہ اقرار، نہ انکار، ملو
آخری بار ملو

لاہور ۲۳ $\frac{11}{67}$

فِگار پاؤں مِرے

فِگار پاؤں مِرے، اشک نارسا میرے
کہیں تو مِل مجھے اے گم شدہ خدا میرے

مَیں شمعِ کشتہ بھی تھا، صبح کی نوید بھی تھا
شکست میں کوئی انداز دیکھتا میرے

وہ دردِ دل میں ملا، سوزِ جسم و جاں میں ملا
کہاں کہاں اُسے ڈھونڈا جو ساتھ تھا میرے

ہر اِک کے شعر میں مَیں اُس کا عکس دیکھتا ہوں
مِری زباں سے جو اشعار لے گیا میرے

سفر بھی مَیں تھا، مسافر بھی مَیں تھا، راہ بھی مَیں
کوئی نہیں تھا کڑے کوس ماسوا میرے

وفا کا نام بھی زندہ ہے، مَیں بھی زندہ ہوں
اب اپنا حال سُنا مجھ کو بے وفا میرے

وہ چارہ گر بھی اُسے دیر تک نہ پہچانا
جگر کا زخم تھا، نغموں میں ڈھل گیا میرے

حرفِ سادہ

معاشرانِ خرابات حرفِ سادہ سے
زبانِ دل سے کبھی عارفانہ بھی سُنتے

قتیلِ زمزمۂ وصل و نالۂ ہجراں
نوائے حسرتِ غیر عاشقانہ بھی سُنتے

روایتِ اَبَدی پر یقین سے پہلے
حقیقتِ ازلی کا ترانہ بھی سُنتے

اِس انتہائے جلال و جمال سے آگے
خیال کا سبقِ ناصحانہ بھی سُنتے

زکوٰۃِ دل کبھی دیتا غرورِ کج کُلَہی
نِکاتِ ذہن کبھی عاجزانہ بھی سُنتے

یہ دَوڑتی ہُوئی راتیں، یہ بھاگتے ہُوئے دن
صدائے مسئلہؑ جاوِدانہ بھی سُنتے

حدیث کی رَوِشِ عامیانہ سے ہٹ کر
خِرد کا تذکرۂ عالمانہ بھی سُنتے

یہ قُرَاتوں کے دھوئیں میں گھٹے ہُوئے ماحول
ہوا کا زمزمۂ بے کرانہ بھی سُنتے

سیاسیاتؔ و تمدّن کے ناز پروردہ
صعوبتِ قفس و تازیانہ بھی سُنتے

یہ قید و بند، یہ تعزیر، عام باتیں ہیں
شکایتِ دل و جاں مشفقانہ بھی سُنتے

سزا جزا کے عوض آدمی سے عرضِ حیات
وفا جفا کی طرح دوستانہ بھی سُنتے

مصاحبوں نے بہت کچھ جنھیں بتایا ہے
زبانِ خلقِ خدا غائبانہ بھی سُنتے

غرورِ عشق کو خوئے نیاز سے ملتے
تعلّیوں کو مری شاعرانہ بھی سُنتے

راولپنڈی ۱/۶۸ء

کس وقت اُجالا پھیلے گا

کس وقت اُجالا پھیلے گا، اے صبح دمسا کی تیرہ شبی
کب آئے گا دورِ ساغرِ دل، اے کوثرِ جاں کی تشنہ لبی

سب ننگ بہ جیبِ بیٹھے، سر ہی نہ تھا، زخموں کا کوئی خوگر ہی نہ تھا
ہر شخص میں تھی درماں طلبی، کیا کج کلہی، کیا کم نسبی

ہم بات کریں تو کس سے کریں، بنیاد رکھیں تو کس پہ رکھیں
اے اہلِ ہنر کے عجزِ سخن، اے زندگیوں کی بے سببی

سنسان پڑی ہیں برسوں سے سب رُشد و ہدایت کی راہیں
اس عہد میں ہم سب اپنے امام، اس دَور میں ہم سب اپنے نبی

میں سفلگیوں سے کھیلا ہوں، مٹی کی تہوں سے لایا ہوں
تہذیب کا یہ معیارِ نظر، اخلاق کی یہ عالی نسبی

لاہور ۷ ۱/ ۶۸

نذرِ غالب

○

اِس کشمکشِ ذہن کا حاصِل نہیں کچھ بھی
انکار کو ٹھکرائیے، نہ اقرار کو چاہیے

مفرورِ طلب رات کو حاصل کرے بن باس
مغرور بدن گرمئ بازار کو چاہے

سنبھلے نہ خمِ زیست سے بوجھ آبِ ہوا کا
آسائشِ دُنیا در و دیوار کو چاہے

آنکھیں روشِ دوست پہ بچھتی چلی جائیں
اور دوست کہ طبعِ سرِ خود دار کو چاہے

قوم ایسی کہ چلتے ہُوئے اشعار سے مانوس
مضمون کہ اِس صورتِ دشوار کو چاہے

اِک دل کہ بھر آئے نہ سمجھے ہُوئے غم سے
اِک شعر کہ پیرایۂ اظہار کو چاہے

سین فرانسسکو۔ امریکہ

نذرِ داغ

○

اُمید و بیم دست و بازوئے قاتل میں رہتے ہیں
تمھارے چاہنے والے بڑی مشکل میں رہتے ہیں

نکل آ اب تو ان پردوں سے باہر، دُخترِ صحرا
کہ باہر کم ہیں وہ طوفان جو محمل میں رہتے ہیں

جنھیں دیکھا نہیں دنیا کی بے تعبیر آنکھوں نے
بہت سے لوگ اُن خوابوں کے مستقبل میں رہتے ہیں

چلو افلاک کے زینوں پہ چڑھ کر عرش تک پہنچیں
کہ سیّد مصطفیٰ زیدی اسی منزل میں رہتے ہیں

پیرس

سپردگی کا یہ عالم

سپردگی کا یہ عالم کہ جیسے نغمہ و رنگ
ہوا، زمین، فضا، بے کراں، خلا، آفاق
تمام عالمِ روحانیاں، تمام حواس
پگھل کے حلقۂ یک آرزو میں ڈھل جائیں

ہر ایک پور میں کھُل جائیں سیکڑوں گرہیں
ہر ایک قطرۂ شبنم میں سوزِ قلزم ہو
رچی ہُوئی ہے بدن میں لہو کی قوسِ قزح
یقین ہی نہیں آتا کہ جیسے یہ تم ہو!

اور ایک ہم ہیں، شکارِ ہزار اندیشہ
تمام کرب و تجسّس، تمام وہم و گُماں
زباں پہ قفلِ طلسماتِ روز و شب ڈالے
خیال و خواب کی آہٹ سے چونکنے والے

کوئی رفیقِ جنوں، کوئی ساعتِ مرہم
روایتاً بھی نہ دیکھے ہماری سمت کہ ہم
ہزار مصلحتوں کو شمار کرتے ہیں
تب ایک زخمِ جگر اختیار کرتے ہیں

لندن ۱۲ ۶/۶۸

چارہ گرو

صنم کدوں میں چراغاں ہے، مے کدوں کی طرف
نگاہِ پیرِ مغاں کی سبیل جاری ہے
ہر اک فسوں ہے، مگر بے اثر ہے چارہ گرو

اِدھر بھی تشنہ لبی مستقل نہیں جاتی
یہاں بھی نشّۂ نا معتبر ہے چارہ گرو

مَیں ایسا جادۂ منزل گزشتہ ہوں جس کے
ہر ایک سنگ میں زخمِ سفر ہے چارہ گرو

ہر ایک دن کی طرح تھا وصال کا دن بھی
جِلو میں فرش، نہ قدموں میں آسمان لیے
قریب آئے اور آکر بدل گئے موسم
گزر گئی شبِ ہجراں بغیر جان لیے

کوئی سُنے بھی تو کیا داستاں سناؤں اُسے
حدیثِ شام و سحر مختصر ہے چارہ گرو
سوائے یہ کہ دل آشفتہ سر ہے چارہ گرو

لندن ۶ ۷/۶۷

جہاں میں ہُوں

نفَس کو فکر جوہر ہے، جہاں میں ہُوں
سمندر ہی سمندر ہے، جہاں میں ہُوں

بُجھی جاتی ہیں قندیلیں توہُّم کی
طلوعِ عقلِ خاور ہے، جہاں میں ہُوں

نظر آتی ہے اپنی ماہیّت جس میں
وہ آئینہ میسّر ہے، جہاں میں ہُوں

اَزل کی بے نقابی اور اَجَل کی بھی
سبھی اِمکاں کے اندر ہے، جہاں میں ہوں

نہ کوہِ قاف کی پریوں کے جُھرمٹ ہیں
نہ غولِ دیو و اژدر ہے، جہاں میں ہُوں

نہ سفّاکی، نہ دلداری کی رسمیں ہیں
نہ مرہم ہے نہ خنجر ہے، جہاں میں ہوں

خدا ہے اپنے نیلے آسمانوں میں
زمیں ہے، خیر ہے، شر ہے، جہاں میں ہوں

قدم اُٹھتے ہیں نامعلوم سمتوں کو
ہر اک شے بے مُقدّر ہے، جہاں مَیں ہُوں

نفَس ہے تشنگی کا دشتِ بے منزل
نفَس ہی موجِ کوثر ہے، جہاں مَیں ہُوں

بدن کیا چیز ہے، خود میرا سایہ بھی
مِرے سائے سے باہر ہے، جہاں مَیں ہُوں

ہیمبرگ۔ نیو یارک ۷ 11/68

فرہاد

اُس سے مِلنا تو اِس طرح کہنا :۔
"تُجھ سے پہلے مری نگاہوں میں
کوئی رُوپ اس طرح نہ اُترا تھا
تجھ سے آباد ہے خرابۂ دل
ورنہ مَیں کس قدر اکیلا تھا

تیرے ہونٹوں پہ کوہسار کی اوس
تیرے چہرے پہ دھوپ کا جادو
تیری سانسوں کی تھرتھراہٹ میں
کونپلوں کے کنوار کی خُوشبو"

وہ کہے گی کہ اِن خطابوں سے
اور کِس کِس پہ جال ڈالے ہیں
تم یہ کہنا کہ پیشِ ساغرِ جم
اور سب مٹّیوں کے پیالے ہیں

ایسا کرنا کہ اِحتیاط کے ساتھ
اُس کے ہاتوں سے ہات ٹکرانا
اور اگر ہو سکے تو آنکھوں میں
صِرف دو چار اشک بھر لانا

عشق میں اے مُصّبرینِ کرام
یہی تکنیک کام آتی ہے
اور یہی لے کے ڈوب جاتی ہے

کوالالمپور ۱/۶۶

کوہِ ندا

ایُّہا النّاس چلو کوہِ ندا کی جانب
کب تک آشفتہ سَری ہو گی نئے ناموں سے
تھک چکے ہو گے خرابات کے ہنگاموں سے
ہر طرف ایک ہی انداز سے دن ڈھلتے ہیں
لوگ ہر شہر میں سائے کی طرح چلتے ہیں
اجنبی خوف کو سینوں میں چھپائے ہوئے لوگ
اپنے آسیب کے تابوت اُٹھائے ہوئے لوگ
ذات کے کرب میں، بازار کی رُسوائی میں
تم بھی شامل ہو اس انبوہ کی تنہائی میں

تم بھی اک بادیہ پیما ہو خلا کی جانب
خود ہی سوچو کہ ہر اک در سے ملا کیا آخر
کارآمد ہوئی فریاد کہ ناکام ہوئی
اپنی گلیوں میں سے کس کس نے ستایا تم کو
دشتِ غربت میں کہاں صبح، کہاں شام ہوئی
کس نے سوئے ہوئے اسبابِ فغاں کو چھیڑا
کس نے دُکھتے ہوئے تارِ رگِ جاں کو چھیڑا
کس نے سمجھائیں تمھیں عشرتِ غم کی باتیں
کون لایا تمھیں اندوہِ وفا کی جانب
اب کدھر جاؤ گے، کیا اپنا وطن کیا پردیس
ہر طرف ایک سی سمتوں کا نشاں ملتا ہے
اپنی آواز بکھر جاتی ہے آوازوں میں
اپنا پندار ملول و نگراں ملتا ہے
پھونک کر خود کو نظر آتی ہے احساس کی راکھ

وقت کی آنچ پہ لمحوں کا دھواں ملتا ہے
راستے کھوتے چلے جاتے ہیں سناٹوں میں
مشعلیں خود بخود آتی ہیں ہوا کی جانب

کب تک افسانہ و افسوں کی حشیشی راتیں
طلبِ جنس و تلاشِ شبِ امکاں کب تک
ذہن کو کیسے سنبھالے گی بدن کی دیوار
درد کا بوجھ اُٹھائے گا شبستاں کب تک
دیر سے نیند کو ترسی ہوئی آنکھوں کے لیے
خواب آور نشۂ عارض و مژگاں کب تک
کتنے دن اور پکارے گی تمھیں جسم کی پیاس
نغمہ و غمزہ و انداز و ادا کی جانب

رات بھر جاگتے رہتے ہیں دکانوں کے چراغ
دل وہ سنسان جزیرہ کہ بجھا رہتا ہے

لیکن اس بند جزیرے کے ہر اک گوشے میں
ذات کا بابِ طلسمات کھلا رہتا ہے
اپنی ہی ذات میں بستی کے کھنڈر ملتے ہیں
اپنی ہی ذات میں اک کوہِ ندا رہتا ہے
صرف اِس کوہ کے دامن میں میسّر ہے نجات
آدمی ورنہ عناصر میں گِھرا رہتا ہے
اور پھر ان سے بھی گھبرا کے اُٹھاتا ہے نظر
اپنے مذہب کی طرف اپنے خدا کی جانب
اَیُّھا النّاس چلو کوہِ ندا کی جانب

ہانولولو (ہوائی)

ویٹ نام

کل مرے دوست کی ہنستی ہوئی نیلی آنکھیں
دُور سے آئے ہوئے خط کے ہر اندیشے کو
وہم کہتی تھیں، سمجھتی تھیں کہ یہ شکل جسے
اُس نے دیکھا ہے ابھی کیمپ کے آئینے میں
مُسکراتی ہوئی جب اپنے وطن پہنچے گی
کوئی بھیگی ہوئی پلکوں سے اُسے چُومے گا
اور شرمندہ نگاہوں سے مسرّت کی کرن
ایسے پھُوٹے گی کہ پھر رات کا امکاں نہ رہے

اور اب میں ہوں، ہوا میں مرے سگرٹ کا دھواں
تام چینی کے نئے مگ میں کسیلی کافی
اسٹریچر پہ یہ پھیلا ہوا فوجی کمبل
اُس کے بے جان بدن کا یہ اکیلا ساتھی
ابھی "رَن وے" پہ کوئی قبر نما طیّارہ
میرے اِس آخری دیدار کو لے جائے گا
سائبرگان اپنے ایرپورٹ کے سنّاٹے میں
مجھ سے پُوچھے گا وہی چند سوالات کہ جو
مجھ سے پہلے بھی کسی اور سے پُوچھے ہوں گے

سائبرگان

مُسافر

مرے وطن، تری خدمت میں لے کر آیا ہوں
جگہ جگہ کے طلسمات، دیس دیس کے رنگ
پُرانے ذہن کی راکھ، اور نئے دلوں کی اُمنگ
نہ دیکھ ایسی نگاہوں سے میرے خالی ہاتھ
نہ یُوں ہو میری تہی دامنی سے شرمندہ
بسے ہوئے ہیں مرے دل میں سیکڑوں تحفے
بہت سے غم، کئی خوشیاں، کئی انوکھے لوگ
کہیں سے کیف ہی کیف اور کہیں سے درد ہی درد

جنھیں اُٹھا نہیں سکتا ہر ایک دشت نورد
جو تھیلیوں کے شکم میں سما نہیں سکتے
جو سُوٹ کیس کی جیبوں میں آ نہیں سکتے

بچھڑ کے تجھ سے کئی اجنبی دیاروں نے
مجھے گلے سے لگایا، مجھے تسلّی دی!
مجھے بتائے شبِ تیرہ و سیاہ کے راز
مرے بدن کو سکھائے ہزار اِستلذاذ
کچھ اس طرح مرے پہلو میں آئے زہرہ و شمس
مَیں مدّتوں یہی سمجھا کیا کہ جسم کا لمس
ازل سے تا بہ ابد ایک ہی مسرّت ہے
کہ سب فریب ہے، میرا بدن حقیقت ہے
اور اِس طرح بھی ہُوا ہے کہ میری تنہائی
سمندروں سے لپٹ کر، ہوا سے ٹکرا کر

کبھی سمیٹ کے مجھ کو نئے جزیروں میں
کبھی پہاڑ کے جھرنے کی طرح بکھرا کر
کبھی بٹھا کے مجھے آسماں کے دوش بدوش
کبھی زمیں کی تہوں میں، جڑوں میں پھیلا کر
کچھ اس طرح مرے احساس میں سمائی ہے
کہ مجھ کو ذات سے باہر نکال لائی ہے
کچھ ایسا خواب سا، ناخوابیاں سی طاری تھیں
بدن تو کیا، مجھے پرچھائیاں بھی بھاری تھیں

مرے دیار، کہاں تھے ترے تماشائی
کہ دیدنی تھا مرا جشنِ آبلہ پائی
کچھ ایسے دوست ملے شہرِ غیر میں کہ مجھے
کئی فرشتہ نفس دشمنوں کی یاد آئی
مَیں سوچتا ہوں کہ کم ہوں گے ایسے دیوانے

نہ کوئی قدر ہو جن کی ، نہ کوئی رُسوائی
مجھے بُجھا نہ سکی یخ زدہ ہوائے شمال
مجھے ڈبو نہ سکی قلزموں کی گہرائی
نہ جانے کیسا کُرہ تھا مرا وجود کہ روز
مرے قریب زمیں گھومتی ہُوئی آئی

تلاش کرتے ہُوئے گُم شدہ خزانوں کو
بہت سے مِصر کے فرعون مقبروں میں ملے
زبانِ سنگ میں جو ہم کلام ہوتے ہیں
کچھ ایسے لوگ پُرانے مُجسّموں میں ملے
بلند بام کلیسا میں تھے وہی فن کار
جو خستہ حال مساجد کے گُنبدوں میں ملے
مری تھکی ہُوئی خوابیدگی سے نالاں تھے
وہ رت جگے جو مسائل کی کروٹوں میں ملے

کئی سُراغ نظر آئے داستانوں میں
کئی چراغ کتابوں کے حاشیوں میں ملے

سُنا کے اپنے عروج و زوال کے قصّے
سبھی نے مجھ سے مرا رنگِ داستاں پُوچھا
دکھا کے برف کے موسم، مرے بزرگوں نے
مزاجِ شعلگیٔ عصرِ نوجواں پوچھا

مری جھکی ہُوئی آنکھیں تلاش کرتی رہیں
کوئی ضمیر کا لہجہ، کوئی اُصول کی بات
گزر گئی مری پلکوں پہ جاگتی ہُوئی رات
ندامتوں کا پسینہ جبیں پہ پھُوٹ گیا
مری زباں پہ ترا نام آکے ٹوٹ گیا

قبول کر یہ ندامت کہ اِس پسینے کی
ہر ایک بُوند میں چنگاریوں کے ساتچے ہیں
قبول کر مرے چہرے کی جھُریاں جن میں
کہیں جنوں، کہیں تہذیب کے طمانچے ہیں
سنبھال میرا اشک ہدیۂ غمِ ادراک
جو مجھ کو سات سمندر کا زہر پی کے مِلا
ثقافتوں کے ہر آتش فشاں میں جی کے مِلا
طلب کیا مجھے یونان کے خداؤں نے
جنم لیا مرے سینے میں دیوتاؤں نے
فریب و حرص کے ہر راستے سے موڑ دیا
اور اُس کے بعد۔ سُپر مارکٹ پہ چھوڑ دیا
جہاں بس ایک ہی معیارِ آدمیت تھا
ہجومِ مرد و زناں محوِ سیر و وحشت تھا
گھڑی کا حُسن، نئے ریڈیو کی زیبائی

پلاسٹک کے کنول —— نائلان کی ٹائی
اطالیہ کے نئے بوٹ، ہانگ کانگ کے ہار
کرائسلر کی نئی رینج، ٹوکیو کے سنگار
ہر ایک جسم کو آسودگی کی خواہش تھی
ہر ایک آنکھ میں اسباب کی پرستش تھی
یہ انہماک قیادت میں بھی نہیں ملتا
یہ سوئے نفس عبادت میں بھی نہیں ملتا

مرے وطن مرے سامان میں تو کچھ بھی نہیں
بس ایک خواب ہے اور خواب کی فصیلیں ہیں
قبول کر مری میلی قمیص کا تحفہ
کہ اس کی خاک میں سجدوں کی سرزمینیں ہیں
نہ دُھل سکے گا یہ دامن کہ اس کے سینے پر
بیافرا کے مقدس لہو کی چھینٹیں ہیں

یہ وہ بیٹ نام کی مٹّی ہے جس کے ذرّوں میں
پیمبروں کی دمکتی ہوئی جبینیں ہیں

سنگاپور ۲ ۲/۶۹

قطعہ

میرے سینے کی روشنائی سے
سُرخ ہے لوحِ دشت و دریا تک
اَن گِنت آہنی فصیلیں ہیں
مارشل لا سے مارشل لا تک

مری پتھرا آنکھیں

اب کے مٹّی کی عبارت میں لکھی جائے گی
سبز پتّوں کی کہانی، رُخِ شاداب کی بات
کل کے دریاؤں کی مٹتی ہوئی مبہم تحریر
اب فقط ریت کے دامن میں نظر آئے گی

بُوند بھر نم کو ترس جائے گی بے سُود دعا
نم اگر ہو گی کوئی چیز تو میری آنکھیں
میری پلکوں کے دریچے، مری بنجر آنکھیں
میرا اُجڑا ہُوا چہرہ، مری پتھرا آنکھیں

قحط افسانہ نہیں، اور یہ بے ابر فلک
آج اُس دیس، کل اِس دیس کا وارث ہوگا
ہم سے ترکے میں ملیں گے اُسے بیمار درخت،
تیز کرنوں کی تمازت سے چٹختے ہُوئے ہونٹ
دُھوپ کا حرفِ جنوں، لُو کا وصیّت نامہ
اور مرے شہرِ طلسمات کی بے در آنکھیں
مِری بے در، مری بنجر، مری پتھر آنکھیں

لاہور ۲۳ ۳/۶۹

بُزدل

آج اک افسروں کے حلقے میں
ایک معتوب ماتحت آیا
اپنے افکار کا حساب لیے
اپنے ایمان کی کتاب لیے

ماتحت کی ضعیف آنکھوں میں
ایک بجھتی ہوئی ذہانت تھی
افسروں کے لطیف لہجے میں
قہر تھا، زہر تھا، خطابت تھی

یہ ہر اک دن کا واقعہ، اِس دن
صرف اس اہمیت کا حامِل تھا
کہ شرافت کے زُعم کے باوصف
مَیں بھی اِن افسروں میں شامِل تھا

پشاور ۲۹ $\frac{۴}{۶۹}$

مِرے زخمی ہونٹ

نشّہ جس وقت بھی ٹوٹے گا، کئی اندیشے
صُبحِ لب بستہ کے سینے میں اُتر آئیں گے
محفلِ شعلۂ شب تاب کے سارے لمحے
راکھ ہو جائیں گے، پلکوں پہ بکھر جائیں گے
ریت در آئے گی سُنسان شبستانوں میں
اور بگولے پسِ دیوار نظر آئیں گے

اس سے پہلے کہ یہ ہو جائے، مرے زخمی ہونٹ
میں یہ چاہوں گا کہ بے لحن و صدا ہو جائیں
میں یہ چاہوں گا کہ بجھ جائے مری شمعِ خیال
اِس سے پہلے کہ سب احباب جدا ہو جائیں

اِس لیے مجھ سے نہ پوچھو کہ صفِ یاراں میں
کیوں یہ دل بے ہُنر و حسن و تمیز اِتنا ہے
اور اے دیدہ ورو! یہ بھی نہ پوچھو کہ مجھے
ساغرِ زہر بھی کیوں جاں سے عزیز اِتنا ہے

کراچی ۱۹ ۵/۶۹

راکھ

میں رات ایسے جزیرے میں تھا جہاں مجھ کو
ہر ایک ٹھوس حقیقت ملی گماں کی طرح
پکارتا تھا پُر اسرار عالمِ موجود
تھکی تھکی ہُوئی ارواحِ رفتگاں کی طرح
دمک رہا تھا ہر اک گوشۂ وطن لیکن
خزاں کی دھوپ میں صحرائے بیکراں کی طرح
مَیں اپنی قوم سے اپنی زباں میں گویا تھا
زبانِ شہرِ خموشاں کے ترجماں کی طرح
سجے ہُوئے تھے سنگھاسن پہ عارضی حاکم
قوائے ارض و سما کے مزاج داں کی طرح
ہر ایک شخص طلب گار تھا کہ شام و سحر
اُسی کا نام لیا جائے اور اذاں کی طرح

وہ داستاں تھی کسی اور شاہزادے کی
مرا لہو تھا فقط زیبِ داستاں کی طرح

میں ایسا سہم گیا تھا کہ تیرا سایہ بھی
ڈرا رہا تھا مجھے دشتِ بے اماں کی طرح

وہ میرا عکس تھا یا اور کوئی صورت تھی
جو آئینے میں ملی یارِ بدگماں کی طرح

مرا فگار قلم لکھ رہا تھا آج کی بات
زوالِ عہدِ گزشتہ کے نوحہ خواں کی طرح

وہ حبس تھا کہ نظر آئے جس میں شہر کا شہر
گھٹے گھٹے ہوئے زندانِ نازیاں کی طرح

زبان کٹ گئی مدحِ ستم گراں کرتے
ضمیر بک گئے اسبابِ مفلساں کی طرح

مسائلِ دل و جاں حل کیے گئے لیکن
سخن طرازیٔ اجلاسِ ناصحاں کی طرح

اِک ایسے گھر میں رہائش مجھے وعید ہوئی
کہ جو قفس کی طرح تھا نہ آشیاں کی طرح

مِلا اک ایسا تمدن مجھے وراثت میں
جو اجنبی کی طرح تھا نہ باپ ماں کی طرح

اِک ایسے گیت کی لَے بخش دی گئی مجھ کو
جو بھیک ہی کی طرح تھا نہ ارمغاں کی طرح

جدھر جدھر سے بھی گزرا جلوسِ رُسوائی
کھڑے تھے لوگ دریچوں میں شمع داں کی طرح

لیے ہوئے مرے ناکردہ جُرم کی فردیں
ہر ایک دوست ملا مرگِ ناگہاں کی طرح

بوقتِ قتل بہت دُور میرے سارے عزیز
صف آزما تھے نگہبانِ آسماں کی طرح

جنوں کی آگ میں جل بجھ چکا ہے میرا وجود
میں اُس کی راکھ سے ڈالوں کہاں کہاں کی طرح

لاہور ۵ $\frac{۸}{۶۹}$

کوئی قلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ مدد دے

لُٹ گئی دولتِ ایمان و متاعِ عرفاں
کعبہ منبر و محراب و کلیسا مدد دے

آج اولاد پہ ہے قحطِ ضمیر و جرأت
خونِ اجداد رسد! عزّتِ آبا مدد دے

میں اکیلا نکل آیا ہوں ستاروں کی طرف
کرّۂ ارض کی اے مجلسِ شوریٰ مدد دے

سامری سانپ مری سمت بڑھے آتے ہیں
زورِ اعصائے کلیم و یدِ بیضا مدد دے

لحن و آہنگ کے شہروں میں اُتر آیا ہے
اجنبی خوف کا پھیلا ہُوا صحرا مَدَدے

آج گم گشتۂ منزل ہیں روایاتِ خضر
آج بیمار ہے صدیوں کا مسیحا مَدَدے

پیاس ایسی کہ زباں مُنہ سے نکل آئی ہے
کوئی قُلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ مَدَدے

برف باری مرے کمرے میں اُتر آئی ہے
تابشِ زمزمہ و حدّتِ صہبا مَدَدے

ایک بزدل مرے سینے میں بڑی دیر سے ہے
جرأتِ خودکشی و قتلِ اعزّا مَدَدے

میں تو دونوں ہی کی لوری سے بہل جاؤں گا
قربتِ ساحل و گہوارۂ دریا مَدَدے